

”راہ نور“

زندگی کی محراب پر درج تحریر کا پہلا لفظ ”موت“..... ہے۔

مسجدوں میں فجر کی نماز کے لیے جماعتیں کھڑی ہو رہی تھیں اور وہ انہیں اپنی کار میں بیٹھا کر مینٹل ہاسپٹل سے بھگا کر لے جا رہا تھا۔ کہیں بہت دُور۔ جہاں کوئی انہیں مرنے سے نہ روک سکے..... جہاں وہ تینوں اطمینان سے اجتماعی خودکشی کر سکیں.....

ہادی..... طلال..... ابراہیم.....

سفید کار لاہور کی حدود سے باہر نکل رہی ہے۔ فجر کی نماز ان بے نمازیوں کی قضاء ہو چکی ہے۔ جو زندگی کے فرض کو ”موت“ کی قضاء سے بدلنے جا رہے ہو، انہیں نماز، روزہ، زکوٰۃ، بندگی سے کیا لینا دینا۔ انہیں کل بھی مرنا تھا اور آج بھی..... انہیں زندگی سے رات بھی بے زاری تھی اور آج اس نئے دن بھی.....

مایوسی ایسا اندھیرا ہے جس کے اس پار کوئی چراغ جلتا ہوا دکھائی نہیں دیتا.....

غم ایسی آگ ہے جو زندگی کے نخلستان کو جہنم میں بدل دیتی ہے.....

ابراہیم..... یہ ڈرائیونگ کر رہا ہے۔ وہ ان دو سے قد میں لمبا ہے، پانچ فٹ دس انچ۔ سخت ورزشی جسم کا مالک ہے۔ اس کی ٹی شرٹ اور کھلے بٹنوں کی چیک شرٹ اس کے مسلز کی ساخت کو چھپانے میں ناکام ہیں۔ اس کی آنکھوں میں گہری اداسی کا گمان تو ہوتا ہے لیکن اس کے چہرے پر روشنی یہ یقین بھی دیتی ہے کہ اس کے اندر کہیں کوئی مشعل روشن ہے۔

ابراہیم نے ریڈیو آن کیا تو فرنٹ سیٹ پر بیٹھے طلال نے ہاتھ بڑھا کر بند کر دیا۔ طلال..... وہ ان دو میں سب سے زیادہ ہنڈسم اور چارمنگ ہے۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے کبھی وہ کسی انٹرنیشنل برانڈ کا ماڈل ایمپیسڈ رہا ہوگا۔ اس کے چہرے کی تختی اور آنکھوں کی نمی کا تال میل نہیں بیٹھتا۔ وہ پتھر ہونا چاہتا ہے، اور آنکھ میں سمندر رکھتا ہے..... کیوں؟؟ کس لیے؟

پچھلے سیٹ پر سرگرا کر، ٹانگیں پھیلا کر ہادی پڑا ہے۔ اسے سورج، چاند، ستاروں، آسمان، دن، روشنی، انسانوں سمیت دنیا کی ہر شے اور ہر نظارے سے شدید نفرت ہے۔ اسی لیے اس نے آنکھوں کو دونوں بازوؤں سے ڈھانپ رکھا ہے۔ وہ جو آخری چیز دیکھنا چاہتا ہے وہ نئے ”دن کی روشنی“ ہے۔ وہ جس پہلی چیز سے دور بھاگتا ہے وہ ”اندھیرا“ ہے۔

”ہمیں کتنا وقت لگے گا وہاں پہنچنے میں؟“ ڈیڑھ گھنٹے بعد ہادی نے جھنجھاکر پوچھا۔ اسے راستے میں ریل کی پٹری نظر آئی تھی اور

اس پر کٹاپڑا اپنا سر اور دھڑ.....

”ڈھائی تین گھنٹے اور لگ جائیں گے.....“

ابراہیم نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور پھر کھڑکی سے باہر۔ سورج کی کرنوں نے زمین کو روشن کرنا شروع کر دیا تھا۔ دُور ہر طرف کھیت لہلہا رہے تھے۔ نیلی، پیلی وردیوں میں بچے اسکولوں کی طرف جا رہے تھے۔ پیدل اور سائیکلوں پر لدے پھندے، عذیاں کھڑکاتے، سائیکلیں لہراتے..... اس نے ہارن دیا تو انہوں نے شرارتا کار کا راستہ روک لیا.....

”سپیڈ بڑھا دونا یار! ڈر کر پیچھے ہو جائیں گے.....“ ہادی کے لہجے کی تندہی گواہ تھی کہ اس کے اندر آگ لگی ہوئی ہے۔

”بچے ہیں یار! ذرا شرارت کر رہے ہیں..... ابھی راستہ صاف ہو جائے گا.....“

”اگر انہیں جانے کی جلدی ہے تو مجھے بھی مرنے کی جلدی ہے..... تم سپیڈ بڑھاؤ بس.....“

ابراہیم نے سپیڈ تو نہیں بڑھائی لیکن اس نے ہارن پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ بچے گردنیں موڑ موڑ کر کار کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ انہیں منہ چڑھانے لگیں۔ وہ سپیڈ بڑھا کر آگے نکلتا کہ سر پر گھاس کا گٹھا اٹھا کر پیدل چلتی ماں جی نے ہانپ کر گٹھا بونٹ پر رکھ دیا اور کھڑکی کی طرف جھک کر کہا۔

”پتر! پانی ہے؟؟؟“

پتر ابراہیم نے پانی کی بوتل ان کی طرف بڑھا دی۔ انہوں نے اطمینان سے پانی پیا۔ پلو سے چہرے اور گردن کا پسینہ صاف کیا۔ بہت آرام و اطمینان سے گٹھے کو واپس سر پر جمایا اور کھڑکی کی طرف جھک کر کہا۔

”اللہ بھلا کرے..... خیر پائے.....“

زندگی کی خیر کو موت کے حوالے کرتا ہادی ہاسپٹل کی ساتویں منزل پر جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اندھیرے کا شہر، مصنوعی روشنیوں میں ٹٹم رہا تھا۔ اتنی زیادہ سختی کے باوجود وہ نائٹ ڈیوٹی اسٹاف کو چمکا دینے میں کامیاب ہو کر، چھت کی طرف بھاگ گیا تھا۔ جس وقت وہ تقریباً چھلانگ لگا ہی چکا تھا، ٹھیک اسی وقت ابراہیم نے پیچھے سے آ کر اسے پکڑ لیا تھا۔ پورے ہاسپٹل میں الارم گونج رہے تھے۔ سارا شہر اس ہاسپٹل کے ساتھ جاگ گیا تھا۔ ساری دنیا نے اپنے کانوں میں انگلیاں ڈھونس لی تھیں۔ کائنات کی سانس و حیات نے اپنی آنکھیں میچ لیں تھیں.....

اسٹاف کے گیارہ لوگ اسے گھسیٹ کر نیچے اس کے روم میں لائے تھے۔ نرس اسے انجکشن لگا رہی تھی۔

”چھوڑ دو خدا کے لیے..... مجھے مرنے دو..... مرنے دو مجھے.....“ ہوش سے بے گانہ ہوتے ہوئے بھی وہ مسلسل یہی بڑبڑا رہا

تھا۔ اپنا سر ٹخ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے گئے تھے پھر بھی وہ تڑپ تڑپ کر ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔

”تم مرنا چاہتے ہو؟“ اس کا سر سہلاتے ہوئے ابراہیم پوچھ رہا تھا۔

اپنی بند ہوتی آنکھوں کو بمشکل کھولتے ہوئے ہادی نے سوال پوچھنے والے کو دیکھنا چاہا۔ یہ سوال پوچھنے والا وہ پہلا شخص تھا۔
 ”ہاں! میری مدد کرو پلیز.....“ اس کی دھندلی بند ہوتی آنکھوں سے آنسو اُڑ آئے۔

”میں تمہاری مدد کروں گا..... میں کروں گا مدد..... میرا یقین کرو.....“

وہ اس کے کان میں سرگوشیاں کر رہا تھا۔ ابراہیم صبح تک اس کے سر ہانے بیٹھا رہا تھا، اور بار بار یہی کہتا رہا تھا۔ ہادی کے نیم خوابیدہ دماغ نے ”میں تمہاری مدد کروں گا“ کا جملہ یاد کر لیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کے لیے مدد آچکی ہے۔
 ”میں خود تمہیں ماروں گا۔ میرا وعدہ ہے تم سے..... لیکن تم خود سے کچھ نہ کرنا.....“

ہادی بے یقینی سے ابراہیم کو دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ ہر ڈاکٹر، نرس، سواپیر، اسٹاف ممبر کی منت کر چکا تھا۔ انہیں پیسوں کا لالچ دے چکا تھا کہ وہ اسے زہر لادیں، ورنہ ایک ہسپتال یا پھر اس کا گلا گھونٹ دیں، بلندی سے کود جانے دیں۔ وہ کسی کا کچھ نہیں لے رہا۔ وہ تو اپنی چیز، اپنی زندگی لے رہا ہے۔ کسی کا اس سے کیا لینا دینا.....

”اجتماعی خودکشی کے بارے میں تمہارا خیال ہے؟“ اسی دن شام کو ابراہیم اس سے پوچھ رہا تھا۔

”اجتماعی خودکشی.....؟“ اس کی طرح باقی دنیا بھی مرنا چاہتی ہے، اسے اب معلوم ہوا تھا۔

”ہاں..... میں تم..... اور روم نمبر تین کا طلال.....“

”وہ کیسے؟“

”ہاسپتال سے باہر..... کہیں دُور.....“

”دُور کیوں.....؟؟“ وہ ایک ذہین اسٹوڈنٹ رہا تھا۔ ہینگ گلائڈنگ کا شاہین..... ماں کا شیر..... باپ کا بر شیر..... اسے موت کو پالنے کی جلدی تو تھی لیکن لمبی میعاد اور فاصلوں سے نفرت تھی۔

”وہاں ہمیں کوئی روک نہیں سکے گا۔ کوئی بچانے والا بھی نہیں ہوگا۔ ہمیں کفن دفن کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔“

”موت کے لیے مجھے اتنا تر دُر کرنے کی کیا ضرورت ہے بھلا.....؟“ اسے بس فوراً موت چاہئے تھی۔

”تھوڑا بہت تر دو تو بہر حال کرنا ہی پڑے گا.....“ ابراہیم نے سکون سے کہا۔

”میں ٹرین کی پٹری پر لیٹ کر مرنا نہیں چاہتا نہ کسی پہاڑ سے کود کر۔ دریا میں چھلانگ لگا کر بھی نہیں، مجھے پانی سے خوف آتا ہے۔

میں کنپٹی پر ہسپتال رکھ کر یا زہر کھا کر مرنا چاہتا ہوں۔ ورنہ تم میرا گلا گھونٹ دو۔ میں نہیں چاہتا کہ میری لاش گدھ کھائیں یا چیل کووے۔“

”فکر نہ کرو، تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا اور تم مر جاؤ گے۔“ ایسی خوفناک بات ابراہیم نے مسکرا کر کی۔

”ہم یہاں سے نکلیں گے کیسے؟“ اسے شک تھا کہ ابراہیم اسے بہلا رہا ہے۔

”وہ مجھ پر چھوڑ دو..... میں نے انتظام کر لیا ہے.....“

اس نے انتظام کر لیا تھا۔ اسی لیے اذان فجر سے پہلے وہ انہیں اپنی سفید کاریں بٹھا چکا تھا۔ فرنٹ سیٹ پر طلال کو اور رچھلی سیٹ پر

ہادی کو..... ہادی جسے ہواؤں کا شاہین بننے کا شوق تھا۔

شاہین جو بلند یوں کا پرندہ ہے.....

شاہین..... جسے پستیوں سے کچھ لینا دینا نہیں.....

سرکیمیں سمنان تھیں..... اندھیرا روشنی سے جا ملنے کے لیے تیار تھا اور..... ”زندگی موت“ سے.....



صبح کی اُمید بھری فضا، دن کی مکاری میں بدلنے لگی۔

”ذراتیز گاڑی چلاؤ.....“ وہ غصیلان بدتمیز اور بے ادب۔ اس نے اپنی دوا نہیں کھائی تھی اسی لیے وہ پاگل پن کی حد تک چڑچڑاہو

رہا تھا۔

”میں تھک چکا ہوں۔“ اس نے کار کو سڑک کے کنارے روک لیا۔

”تم تھک چکے ہو تو ہمیں کیوں تھکا رہے ہو..... کیا چاہتے ہو..... اتنی دُور کیوں لے آئے ہو ہمیں؟“

”تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم چپ رہو گے، کوئی سوال نہیں کرو گے۔ جو میں کہوں گا وہی کرو گے۔“ ابراہیم نے اچھتی نگاہ سے اسے

دیکھا اور سیٹ کے نیچے ٹانگیں پھیلا لیں۔

”ہونہہ..... بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارا پلان.....“

کار سے اتر کر دروازے کو دھاڑ بند کر کے تیز تیز قدم اٹھاتا وہ کار کی مخالف سمت چلنے لگا۔ اسے آس پاس کسی ایسی چیز کی تلاش تھی

جو اس کا کام تمام کرنے میں اس کی مددگار بن سکتی۔ ٹرین کی پٹری، وزنی پتھر ورنہ پہاڑ کی بلندی.....

تیزی سے کار سے نکل کر ابراہیم اس کی سمت بھاگا۔ پیچھے سے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور پوری قوت سے ایک گھونسا اس

کے جڑے پر مارا۔

”مردوں کی طرح مرنے جا رہے ہو پہلے مردوں کی طرح زبان کا پاس رکھنا سیکھو۔ سمجھے.....؟؟“

ایک گھونسنے کے بعد اس نے اسی گال پر دو اور گھونسنے مارے۔ خون سے اس کا منہ بھر گیا۔ تکلیف سے بے حال ہو کر وہ زمین پر

لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ پچھلے گیارہ مہینوں سے وہ تکلیف میں تھا۔ چھ مہینے سے مینٹل ہاسپٹل میں تھا۔ دوائیوں پر زندہ تھا۔ اس کے جسم میں بچا

ہی کیا تھا جو وہ تین گھونسنے سہہ سکتا۔ ابراہیم کا ہاتھ روک لیتا ورنہ جوابی حملہ ہی کر دیتا۔

فرنٹ سیٹ پر بیٹھا طال اپنے ناخن چباتا رہا۔ اس نے گردن ان کی طرف گھما کر یہ تک دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ وہ کیا کر

رہے ہیں۔ اسے خود سمیت دنیا کی کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ خود بھی مر جائے اور ساری دنیا بھی تباہ و برباد ہو جائے۔ طوفان آئے یا

زلزلہ۔ جنگ ہو یا کہرام برپا۔

وہ تین مہینے پہلے ہاسپٹل آیا تھا۔ اس نے ہاسپٹل میں ایک ہی بار خودکشی کی کوشش کی تھی، لیکن وہ طریقہ ایسا حیران کن اور ششدر کر

دینے والا تھا کہ ڈاکٹر زاور ہاسپٹل کا پورا اسٹاف کتنی ہی دیر تک ساکت کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس کے کمرے میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے وہ اپنے لیے خطرہ بن سکتا۔ پھر بھی..... اپنی دو ناگلوں کو قینچی بنا کر اس نے اپنی گردن کو اس میں ایسے پھنسا لیا تھا کہ اگر اسٹاف تیس سیکنڈ اور لیٹ ہو جاتا تو اس کی گردن کا منکا ٹوٹ چکا ہوتا۔

زندگی کی محراب سے گر کر ٹوٹا ہوا ہادی زمین پر لاش کی طرح پڑا ہوا تھا۔ اس کے سر پر کھڑا ابراہیم اسے افسوس سے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ بچوں کے بل اس کے قریب بیٹھ گیا اور مال نکال کر اس کے منہ سے خون سے صاف کرنے لگا۔

”اپنی اتنی تو ہین نہ کرو ہادی! ویسے بھی آج تمہاری زندگی کا آخری دن ہے۔ اس دن پر تھوڑا سا تو احسان کرو۔ مرنے سے پہلے اسے زندہ رہ کر دکھاؤ۔“

ڈراسا سرائٹا کر اس نے ابراہیم کی طرف دیکھا۔ اس کی پشت سے نکلتی سورج کی کرنیں اس کی اندھیرا آنکھوں کو تکلیف پہنچانے لگیں.....

”اٹھ جا پتر! دن نکل آیا ہے پرندے اپنا رزق کھا مکا بیٹھے ہیں۔ اٹھ جا.....“ سورج کی کرنیں نیم کے درخت سے چھن کر ماں کی گلابی چنی کو چومتیں اس کی آنکھوں کو بڑی بھلی لگ رہی تھیں۔

”دو ہفتوں کے لیے آیا ہوں ماں جی! سکون سے سونے تو دیں..... اور بھلا یہ سورج اتنی جلدی کیوں نکل آتا ہے۔“

”سورج اپنے وقت پر نکلتا ہے تو اپنا وقت سو کر برباد نہ کر۔ اٹھ جا۔ ماں کے پاس بیٹھ کر چار باتیں کر لے۔“

ماں پتر دیاں چار گلاں.....

اک ماں میری او پیاری..... اس ماں نال میری یاری..... میرا دل تے میری حیاتی..... اس ماں توں جنڈواری.....

وہ اٹھا اور نقاہت سے چلتا ہوا کار کی چھت پر دونوں ہاتھ ٹکا کر ہانپنے لگا۔ چند آنسوؤں نے اس کی پوری آنکھیں بھگو دیں۔ ابراہیم

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا اور اسے بیک ویو مرر سے دیکھ رہا تھا۔ وہ جواب آستین سے اپنی آنکھیں رگڑ رہا تھا.....

”پانی پی لو.....“ پانی کی بوتل لے کر وہ باہر نکلا۔

وہ اپنے آنسو پی چکا تھا پانی کو اس نے اس قابل نہیں سمجھا۔ دروازہ دھاڑ بند کر کے سیٹ پر آڑا تر چھا دراز ہو کر اس نے آنکھوں کو

بازوں کی آڑ میں چھپا لیا.....

ماں پتر دیاں چار گلاں.....



چالیس منٹ بعد وہ تینوں کھیوڑہ کان کے باہر کھڑے تھے۔ ٹکٹ ابراہیم کے ہاتھ میں تھے۔

”تم ہمیں یہاں سیر کروانے لے کر آئے ہو؟“ ہادی نے خونخوار نظروں سے ابراہیم کو گھورا۔ طلال بھی ابراہیم کو سوالیہ نظروں سے

دیکھ رہا تھا۔

”مرنے کے لیے اس سے بہتر جگہ پورے پاکستان میں کہیں نہیں ملے گی۔“

”ساری دنیا کو فتح کرنا سکندر اعظم جب یہاں سے گزرا تو اس کی فوج کے گھوڑوں نے پہاڑوں کو چاٹنا شروع کر دیا تھا۔ پتھر کو توڑ کر دیکھا تو اندر نمک تھا۔ ایسے یہ کھیڑا کان دریافت ہوئی تھی۔ یہ دنیا کی دوسری بڑی نمک کی کان ہے۔ یہ اتنی گہری اور لمبی ہے کہ.....“

گائیڈ اسکول کے بچوں کو کان کے دہانے کے پاس کھڑا کر کے لیکچر دے رہا تھا۔ ایک دم سے وہاں بچوں کا اتنا رش بڑھ گیا تھا کہ ان تینوں کو ایک طرف ہو کر انہیں راستہ دینا پڑا تھا.....

”سکندر اعظم کان کے اندر گیا تھا؟“ ایک بچے نے چلا کر پوچھا۔ دوسرے بچوں نے ایسے بے تکی سوال پر قہقہہ لگایا۔

”سکندر یہاں سیر سپاٹے کرنے نہیں آیا تھا، یہ خطہ فتح کرنے آیا تھا۔ جنگجو تھا وہ.....“ گائیڈ چڑ گیا۔

”پھر ہم اندر جا کر کیا کریں گے جب سکندر ہی کان کے اندر نہیں گیا تو.....“ بچے کو ساری دلچسپی صرف سکندر سے تھی۔

”تمہیں وہ نہیں کرنا جو سکندر نے کیا تھا، ”جنگ اور فتح“۔ تمہیں وہ کرنا ہے جو وہ نہیں کر سکا تھا۔ ”زندگی اور انسانیت سے محبت۔“

زندگی اور انسانیت سے محبت.....

تینوں بے زار سے کھڑے یہ آخری فقرہ سن چکے تھے۔ ہادی چند سیکنڈز تک ٹکلی باندھ کر ابراہیم کو دیکھتا رہا۔

”کیا تم ہمیں کسی بھی طرح سے پاگل بنانے کی کوشش کر رہے ہو؟“

”میں تمہیں مینٹل ہاسپٹل سے بھاگا کر لایا ہوں۔ تم پاگل ہی ہو.....“ اس کا لہجہ سخت اور سرد تھا۔

ان دونوں کے ہاتھ میں ان کے ٹکٹ تھا کہ اس نے اپنے قدم اندر کی طرف بڑھا دیئے تھے۔ روشنی جو کان کے دہانے پر گر کر پھیلی ہوئی تھی وہ اندر قدم بڑھاتے بڑھاتے معدوم ہونے لگی تھی۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر چلتا رہا۔ اس کی حسیں پوری طرح سے بیدار تھیں۔ کچھ دیر بعد اسے اپنے پیچھے طال اور پھر ہادی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

کان میں عام لوگوں کا رش بڑھ رہا تھا۔ انہیں جگہ بنا کر چلنا پڑ رہا تھا۔ ہادی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ مرنے کے لیے نمک کی کان کا انتخاب بھی کیا جاسکتا ہے۔ کسی عوامی مقام کا۔ اسکولوں کے تین چار سو بچوں کی موجودگی میں انہیں مرنا ہوگا۔ ایک سال پہلے تک اسے پہاڑ بہت پسند تھے، لیکن صرف بلندی سے۔ اب وہ اس بلندی کی کھوہ میں جا رہا تھا۔ اسے اس عمل سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔

”تم ہمیں کہاں لے جا رہے ہو۔ ہم یہاں کیسے مر سکتے ہیں؟“ ہادی نے پیچھے سے اس کے کالر کو پکڑ کر جھنجھوڑا۔

”دوبارہ گریبان تک نہ آنا۔ ورنہ اس بار گھونٹے پیٹ میں ماروں گا اور آنتیں نکل کر باہر آگریں گی۔ چپ چاپ میرے ساتھ چلتے رہو۔ اگر میں نہ ہوتا تو تم مر کر بھی اس ہاسپٹل سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ میرا احسان مانو۔ تمیز سے بات کرو اور سامنے دیکھ کر سیدھ میں چلتے رہو۔“

سامنے دیکھتے ہوئے وہ سیدھ میں چلتے رہے۔ کان کا نمک پانی بن کر ٹپ ٹپ ٹپک رہا تھا۔ چھوٹی تنگ سی راہداری گیلی ہو رہی تھی۔ وہاں ٹھنڈک تھی، اندھیرہ تھا، اور ٹپ ٹپ پانی تھا۔ لوگوں کی باتیں، بچوں کی ضدیں، ماؤں کی تکراریں۔ نمک کی اس کان میں کتنا کچھ

تھا۔ زندگی پہاڑ کی کھوہ میں بھی چہل پہل رہی تھی۔

”مجھے پیاس لگ رہی ہے۔“ ہادی تھک کر نیچے زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ دو گھنٹے سے مسلسل چل رہے تھے۔

”مرنے جا رہے ہو اور زندگی کی بوند بوند کے لیے تڑپ رہے ہو۔ کیسے دو غلے انسان ہو۔ پانی کی بوتل کا میں رہ گئی ہے۔“ ابراہیم

نے بے زاری سے کہا۔

کان کے جس حصے میں وہ آچکے تھے یہاں اب عوامی رش نہیں رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے ساری کائنات پر رات چھا گئی ہے۔ ابراہیم کے ہاتھ میں لائٹر تھا اب وہ اسی کی روشنی میں چل رہے تھے۔ انتظامیہ کی طرف سے روشنی کا انتظام جہاں تک تھا وہ حصہ وہ بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔

”آگے خطرہ ہے۔ اس طرف جانا منع ہے۔“

کھوپڑی کے کراس سائن کے نیچے ہدایات لکھی تھی۔ کھوپڑی اور تنبیہ دونوں کو صاف نظر انداز کر کے ابراہیم چھوٹے سے لوہے کے دروازے کو کھول کر جھک کر اندر چلا گیا اور ہاتھ کے اشارے سے انہیں اپنے پیچھے آنے کے لیے کہا۔

غیر ارادی طور پر اندر جانے سے پہلے دونوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بہت دور انہیں روشنی کی کچھ آخری کرنیں نظر آئیں۔ بچوں اور عورتوں کی آوازوں کی بھنبھناہٹ۔ کان سے باہر آسمانی جھولے کی گڑ گڑ۔ تیس روپے کی آئس کون والے کی صدا۔ دس روپے کے پاپ کارن والے کی پکار..... دور نیلے آسمان پر روشن سورج کا الوداعی سانس اور رات کے آسمان کے ستاروں کا سناٹا.....

کان کے اندھیرے میں سورج روشن تھا نہ ستارے..... وہاں بس اندھیرا تھا.....

کان کی ٹھنڈک میں زندگی کی گرمی تھی نہ موت کی نرمی..... وہاں بس بے رخی تھی.....

دونوں سر جھکا کر خطرے کو نظر انداز کر کے اندر چلے گئے۔

چیک شرٹ کے بازو فولڈ کیے ابراہیم اطمینان سے چل رہا تھا۔ وہ اتنا پرسکون تھا جیسے کسی ایسی غار کو ڈھونڈ رہا ہو جہاں سے موت کے فرشتے خوش گپیاں کرتے ہوئے نکلیں گے۔ ان سے ہاتھ ملائیں گے خوش آمدید کہیں گے اور اپنی سواریوں پر بٹھا کر زندگی سے نکال کر موت کی طرف لے جائیں گے.....

ابراہیم..... اس جیسے ایشین گولڈ میڈلسٹ باکسر کو موت کا خیال آیا ہی کیونکر تھا..... پھولوں کا گلہ سستا ہاتھ میں لے کر، ملکی جھنڈے کو لہراتے ہوئے وہ تو رنگ میں ناچتا، کودتا، دوڑتا پھر رہا تھا۔ اس نے ایشین گولڈ میڈل جیت لیا تھا۔ اس نے ایمان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے منہ دکھائی میں ”گولڈ میڈل“ دے گا۔ منہ دکھائی کا تحفہ اس نے حاصل کر لیا تھا۔ نکاح کی تیاریاں بھی ہو گئی تھیں..... پھر..... پھر.....

خطرے کے نشان کو پار کر کے چلتے ہوئے انہیں کافی وقت گزر چکا تھا۔ وہ کان کے اس حصے میں آچکے تھا جہاں انتظامیہ کے چند لوگوں کے سوا باہر کی دنیا کا کوئی انسان کبھی آیا ہی نہیں تھا۔

”تم اس جگہ کو کیسے جانتے ہو؟ پہلے آچکے ہو یہاں؟“ ہادی بری طرح سے ہانپ رہا تھا۔

”کان کا نقشہ میں نے انٹرنیٹ پر دیکھ لیا تھا۔“ اس نے ایسے کہا جیسے اس نے کوئی بڑا معرکہ سرانجام دیا ہو۔

”تو مرنے کے لیے تم نے اس جگہ کو ہی کیوں پسند کیا؟“ طلال نے یہ پہلی بات پہلا سوال کیا تھا۔

”کیونکہ یہ جگہ ٹھنڈی ہے اور موت کی گرمی کو تھوڑی ٹھنڈک بھی نصیب ہونی چاہیے۔ یہاں ہماری لاشوں کی بے حرمتی بھی نہیں

ہوگی۔“

”مرنے کے لیے اتنا سوچ بچار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اتنی پلاننگ تو زندہ لوگوں کو زیب دیتی ہے۔“ ہادی نے اداسی سے کہا۔



یقیناً شام کے چار پانچ بج چکے ہوں گے۔ کان کے ورکر ایک آخری چکر لگا کر بچے کچے لوگوں کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر باہر نکال رہے ہوں گے۔ صرف نمک سے بنے اُس چھوٹے سے ہاسپٹل میں استھما کے چند مریض موجود ہوں گے۔ ایک ڈاکٹر نرس اور دو چار دوسرے لوگ۔ ورنہ ساری کان خالی ہو چکی ہوگی۔

”ایک دوسرے کی شرٹ پکڑ لو۔ ہادی تم میری طلال تم ہادی کی۔ اب بس میرے ساتھ گھسیٹتے ہوئے چلو۔“ ابراہیم نے ایکدم سے

لاٹر بچھا دیا۔

”تم نے لاٹر کیوں بند کر دیا ہے؟“

”اب ہم ایک خوفناک چھوٹے سے پل پر سے گزر رہے ہیں..... ویسے کیا تم خوفزدہ ہو؟“ اس نے ہادی کا سوال نظر انداز کر دیا۔

ہادی لب بھینچ کر چپ ہو گیا۔ اس نے ابراہیم کی شرٹ کا کونا پکڑ لیا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ہزاروں فٹ بلندی پر موجود

ہیں۔ نیچے کھائیاں، دلدل، اور زہریلے سانپ بچھو ہیں۔ تین دن پہلے تک وہ زندگی کے خوف سے چیخیں مارتا رہا تھا۔ ”میں زندہ ہوں“ کہ

خوف سے اس کی گھگھکی بندھ جایا کرتی تھی کہ ساری خدائی کو اس کے حال پر ترس آیا کرتا تھا۔ اب وہ سانپ بچھوؤں سے ڈر رہا تھا۔

”بیٹھ جاؤ..... کل اس وقت تک ہم مر چکے ہوں گے۔“

’ابراہیم نے لاٹر روشن کر کے ایک آخری بار ان کی شکلیں دیکھیں اور پھر ذرا سا باہر کی طرف نکل کر لاٹر پھینک دیا۔ وہ ایک چھوٹی

سی کھوہ میں کھڑے تھے جہاں جھک کر کھڑا ہونا پڑ رہا تھا۔ جا بجا نکلیں نمک کی قلمیں ان کے جسموں کو مس کر رہی تھیں۔

ایک لمحہ زندگی کا لمحہ بن کر آیا.....

”کان کے باہر رات ہونے والی ہوگی۔ چاند نکلنے والا ہوگا۔“ کونے میں سکڑ کر بیٹھے ہادی نے زندگی کے بارے میں سوچا۔

اس اندھیری قبر سے باہر اس کے گاؤں میں ہرے بھرے کھیت لہلہاتے ہوں گے۔ مائی سوداں کا چہرہ گھوں گھوں کرتا ہوگا اور

تالاب کے پانی میں بطخیں اپنے پر پھڑ پھڑاتیں ہوں گی۔ دانے دکنے کی جنگ لڑتیں مرغیاں اور مرغے۔ کچی پگڈنڈیوں پر خالی مار دوڑاتے

بچے۔ نہر کنارے بنے اسکول کی گھنٹی کی ٹن ٹن، سبق کے رٹے اور لمبے لمبے سانس کھینچ کر پیٹروں کے رٹے۔ یہ آوازیں آج بھی گاؤں

میں سانس لیتی ہوں گی۔ ویسی انڈے چوزے چرا کر بھاگتا رشید۔ غلیل سے چڑے مار مار بھون بھون کھاتا وزیر۔ ان کی ہنسی ان کی ساری

ہستی بنتی ہوگی..... آج بھی گاؤں پر شام سہانی شہابی چھری اوڑھ کر اتری ہوگی۔
 ہادی کی حالت بگڑنے لگی تھی۔ وہ دوا کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے سر میں جھکڑ چلنے لگے تھے۔ اندھیرا اسے خوفزدہ کرنے لگا تھا۔ لیکن کوئی شخص بازار سے اندھیرے لینے جائے اور یہ توقع رکھے کہ دکاندار بدلے میں اسے چراغ دے دے گا تو ایسا شخص دیوانہ ہی ہو سکتا ہے۔

تمہیں مرنے کے لیے کوئی آسان طریقہ نہیں ملا تھا۔“ طلال پھٹ پڑا۔ وہ ایسے ہی ایکدم سے پھٹتا تھا۔
 ”سو چاشیروں کی طرح زندہ نہیں رہے تو شیروں کی طرح مر ہی جائیں.....“ ابراہیم نے طنز یہ کہا اور قہقہہ بھی لگایا۔
 طلال کا دل چاہا کہ وہ اٹھے اور اس کی گردن دبوچ لے۔ وہ اٹھا بھی، لیکن کمزوری کی وجہ سے ہادی کے پاؤں سے الجھ کر گر گیا۔
 ”زیادہ غصہ نہ کرو اور چپ چاپ اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ۔ شاباش۔“ ابراہیم نے پکپکا را۔ وہ اسے اور غصہ دل رہا تھا۔
 ”منحوس انسان..... ہمیں تکلیف میں دیکھ کر تمہیں ہنسی آرہی ہے.....“ اس کی آواز گھٹنے لگی۔
 ”یہ تکلیف میں نے تو تمہیں نہیں دی؟؟؟“
 ”تم مکار اور چالاک ہو..... کمینے انسان.....“
 ”اوکے! میں یہ سب ہوں؟ تم کیا ہو؟ عقل مند؟ سمجھ دار؟ بہادر؟؟؟“
 جواب میں خاموشی رہی.....



رات تین پہروں میں سے پہلے پہر میں داخل ہو چکی تھی..... پہلا پہر شیطان کے وسوسوں اور خوف کا پہر۔
 ہادی پر نیم غنودگی طاری ہو چکی تھی۔ اور جب اسے لگا کہ موت اس کے سر ہانے آ کر کھڑی ہو چکی ہے۔ سارا جہاں جو اس کی مٹھی میں بند تھا ہاتھ سے پھلنے لگا ہے تو اس نے ایک سسکی لی۔ آنسو اس کے گال پر پھسلے۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے ایسے مرنا پڑے گا۔ وہ تو زندہ رہنا چاہتا تھا..... ہمیشہ سے.....



”دنیا میں سب سے خوب صورت کیا ہے.....؟؟“
 ”پرندے.....“
 ”پرندوں میں سب سے خوب صورت.....؟؟“
 ”اونچی پرواز والے پرندے.....“
 ”اونچی پرواز والوں میں.....؟“
 جو پہاڑوں پر بسیرا کریں..... بلند پرواز، خلوت نشین، تیز نگاہ، غیرت مند..... ”شاہین۔“

کہہ کر بلند حوصلہ شاہین، جوش سے چلاتے ہوئے پہاڑ کی بلندی سے کود گیا۔ پینگ گلائڈنگ کی یہ اس کی پہلی سولو پرواز تھی۔ (مصنوعی پتنگ کے ذریعے اڑنا)۔ بچپن میں وہ ”چڑا“ تھا۔ پھر چیل ہوا، اب وہ شاہین تھا۔ زمین کی بلندی سے پرواز کرتا ہوا، آسمان پر کسی پرندے کی طرح اڑتا ہوا۔

سبزے کے قطعے، پہاڑوں کا خاندان، جھنکار کی طرح گرتی آبشار، پتلی لکیر بناتا دریا، پھر پھر اڑان بھرتے چھوٹے پرندوں کا اہل و عیال..... اچھا تو اوپر سے زمین ایسی دکھائی دیتی ہے۔ پہلے معلوم ہوتا تو وہ سفید بادلوں پر ایک گھر بنا لیتا۔ گھر کی کھڑکیاں کھول کر روزایا نظارہ کرتا.....

ہواؤں کے قافلے، روشنی کے مسافر اس کے لیے تالیاں بجا رہے تھے۔ وہ اُڑ رہا تھا..... وہ اُڑ رہا تھا.....

”ماں جی آپ کا بیٹا شاہین بن گیا ہے۔“ نیچے اترتے ہی اس نے سب سے پہلے ماں جی کو فون کیا تھا۔ خوشی سے اس کی سانس پھول رہی تھی۔

”میرا پتر تو شیر ہے..... ہادی! بس اب گھر آ جا۔ بہنوں کی شادی کے دن قریب آرہے ہیں۔“

”بس ماں جی! آیا کہ آیا.....“

انگلینڈ سے وہ جہاز سے آیا تھا۔ اڈے سے بس سے، اور پھر اسٹاپ سے جلال کی جیپ میں۔ تین دن پہلے اس کا سمسٹر ختم ہوا تھا۔ ماں جی نے اسی کی وجہ سے شادی کی تاریخ کو روکا ہوا تھا۔

نومبر کے آخری دنوں کی دھوپ نے جگنوؤں کو اپنا مہمان بنا کر ہڑپ کر لیا تھا۔ سونے میں چاندی کے ورق گھول کر روشنی کی کرنوں نے، نومبر پر بڑا احسان کیا تھا۔ اس دن ماں بڑی خوش تھی۔ جہیز کے سامان کو دھوپ لگوا رہی تھیں۔ ابا جی نیم کے درخت سے زرا پرے، موڑھے پر بیٹھے ممدو کے ساتھ مل کر شادی کے انتظامات کا حساب کتاب دیکھ رہے تھے۔ چارپائی پر ڈھیلے ڈھالے انداز میں دراز دادا جی حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ بہنیں مہندی، چوڑی، گونا چنر کی مصروفیت کے ساتھ بڑی اترائی اترائی سی تھیں۔ کچھ دیر پہلے اس نے آپا کا پراندہ مٹھی میں لے کر کھینچا تو انہوں نے دھوپ میں سوکھتی مرچوں کو ہتھیلی پر مسل کر اس کی آنکھوں میں بھر دیا۔

”شیر ہوگا ماں کا..... میرے لیے تو ڈڈو ہے..... ڈڈو.....“

ڈڈو نے بدک کر پھر سے آپا کا پراندہ پکڑنا چاہا لیکن جلال نے پیچھے سے آکر خلل ڈال دیا۔ بدلے کو موخر کیا اور جلال کے ساتھ چھت پر چڑھ گیا۔ اسے ہوا میں اُڑنے والی ہر چیز بہت پسند تھی..... پتنگ بھی.....

وہ چھت پر پتنگ اڑا رہا تھا۔ **مانجا لگی** ڈور اتنی تیز نہیں تھی جتنی تیز اور کٹیلی ایک ساتھ کئی جیپوں کے رکنے کی آوازیں تھیں کہ ڈور اس کی ہتھیلی کو چیرا لگاتی ہوئی نکل گئی۔ خون کی پتلی دھارا اس کی ہتھیلی پر ابھری اور اس کا سانس گم ہو گیا۔ جلال منڈیر کے پاس کھڑا تھا، اس نے جھانک کر نیچے دیکھا اور اس کے جسم کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔

گھر کا پھانک مردانہ ٹھوکروں سے دھاڑ کھلاتا تھا۔ آٹھ لوگوں کو مارنے کے لیے وہ اتنی فوج اور اسلحہ لایا تھا..... جب تک وہ نیچے

جھانکے کے لیے منڈیر تک آیا تب تک جہیز کو دھوپ لگواتی اس کی ماں کا سینہ گولیوں سے چھلنی ہو چکا تھا۔ زمین پر گرے اس کے جسم کے قریب خون اپنے نشان چھوڑنے لگا تھا۔

”ابا جی.....“

جب تک دوسری منڈیر کی طرف بھاگ کر اس نے حلق کے بل چلا کر کہا، تب تک فارا ابا جی اور دادا کے جسموں کے آ رہا ہو چکے تھے..... اور جب تک وہ میٹھیاں پھاٹتا، گرتا پڑتا، پہلی منزل کی سیڑھیوں تک آیا، اس وقت تک فارنگ کی آوازیں سن کر کمروں سے نکل کر باہر کو بھاگتیں اس کی بہنیں..... تینوں بہنیں.....

اس کے جسم سے جان نکل چکی تھی..... وقت کی ساری کڑیاں، ٹوٹ کر بکھر چکی تھی..... وہ جان گیا تھا کہ نیچے کوئی نہیں بچے گا۔ تین لاشیں پکھواڑے کے درخت کے پاس پڑی تھیں..... ابا جی، دادا جی اور ممدو کی۔ اس طرف ماں کے ساتھ مائی رحمتاں کی..... اور..... اور گونا کناری لگے پیلے سوٹ میں آپاروزینہ کی۔ برآمدے کے پاس زینب کی، اور نیم کے درخت سے ذرا دُور چھوٹی سحر کی۔ ابا کی لاڈلی مرنے سے پہلے بھی ان ہی کی طرف بھاگی تھی.....

تین دن بعد اسے ایک چھوٹے سے ہسپتال میں ہوش آیا تھا۔ اپنی جان پر کھیل کر جلال نے اسے حویلی کے پچھلے پھانک سے باہر نکال لیا تھا۔ وہ دو گولیوں کے وار سے تونچ گیا لیکن خاندان بھر کی موت کے غم کی کاٹ سے کیسے بچتا.....

اس کے دادا کو اپنے چچا زاد سے نہری زمین کا مقدمہ نہیں جیتنا چاہیے تھا۔

اس کے ابا جی کو دادا جی کو روک دینا چاہیے تھا۔ وہ گاؤں ہی چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ اماں نے اتنا جہیز کس لیے اکٹھا کیا تھا۔ جب ان تینوں کو صرف کفن ہی نصیب ہونے والا تھا۔ سہاگ کے کپڑے اور بارات کی روٹی..... ماں جی نے کیسی بدشگونی کر دی تھی.....

ہوش میں آنے کے تین دن بعد تک وہ گم صم لیکن مارل رہا تھا۔ پھر رات کے اندھیرے میں وہ گاؤں کے قبرستان گیا تھا۔ ماں جی کے پاس، ابا جی کے پاس۔ جھلمل ہنسی ہنسنے والیوں کے پاس۔ چھ قبروں کے سر ہانے کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھنا آسان نہیں تھا۔ وہ کس کس سے لپٹ کر روتا۔ وہ کس کس سے نکھڑ جانے پر ماتم کرتا۔ لوگوں کی دنیا لیتی ہے، اس کا تو جہاں ہی لٹ گیا تھا۔

اور پھر وہ پاگل ہو گیا۔ اگلی بار جب اسے ہوش آیا تو چھ مہینے گزر چکے تھے۔ جلال اسے ایک مینٹل ہاسپٹل میں داخل کروا چکا تھا۔ وہ ہر مہینے اس سے ملنے بھی آتا تھا لیکن وہ اسے بھی نہیں پہچانتا تھا۔ چھ مہینے کے علاج کے بعد اس کی ذہنی حالت میں بہتری آنے لگی تھی۔ اسے آہستہ آہستہ سب یاد آنے لگا تھا، اور یہی برا ہو رہا تھا۔ ایک رات اسے سب یاد آ گیا تھا اور اسی رات اس نے پہلی بار گکے میں پھندا ڈالا تھا۔

ماں کی کھلی آنکھوں کی آہ، باپ کا ڈھلکا ہوا سر، بہنوں کی چیخیں اور اڑتے ہوئے آنچل۔ جلال نے اس کے منہ پر سختی سے ہاتھ رکھ کر اسے چیخنے سے روک لیا تھا پھر بھی دوسری منزل کی کھڑکی سے اس نے دیکھ لیا تھا۔ دیکھ لیا تھا کہ ابا جی کے خون سے لت پت وجود پر وہ جھوک رہا تھا۔ اپنے جوتے سے ان کا منہ مسل رہا تھا۔ ماں کی آنکھیں اوپر منڈیر کی طرف اٹھی رہ گئی تھیں۔ انہیں مرتے ہوئے بھی صرف اپنے شیر

کی فکر تھی۔ اپنی موت کو سامنے دیکھ کر بھی سلامتی کی دعا انہوں نے اسی کے لیے کی ہوگی..... آخری دعا..... ماں نے وہ بھی اس کے نام ہی کر دی ہوگی.....

زندگی دی چار ہی گلاں..... ایک ماں پیاری..... ایک باپ دلا راز..... اک مانی جانی، اک ماں جایا.....
چار دن دی زندگی، زندگی دی چار ہی گلاں..... اک ماں پیاری..... اک ماں دلاری..... اک ماں، اک ماں.....



رات کا دوسرا پہر..... پناہ کا پہر.....

اپنی ساری ہمت جمع کر کے ہادی اٹھا، اور ٹٹول کر ابراہیم کے گلے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔
”چوہے کی طرح بل میں گھس کر مردہ ہونے سے بہتر نہیں تھا کہ ہم زہر پھانک لیتے۔“ پہاڑوں سے کود کر شاہین کی طرح آسمان میں اُڑنے والا چوہے کی طرح مرنے سے ڈر رہا تھا۔ ماں کا شیر..... باپ کا بر شیر..... ہواؤں کا شاہین.....
ابراہیم نے سکون سے اس کے ہاتھ اپنے گلے سے پیچھے ہٹائے۔

”اتنے ہی باہمت تھے تو زندہ رہ کر دکھاتے نا۔ اچھا اب چلے جاؤ۔ باہر نکلو اور زہر پھانک لو، ٹرین کے نیچے آ جاؤ۔ بلڈنگ سے کود جاؤ..... پھندے سے لٹک جاؤ..... جاؤ۔“ ابراہیم عاجز آ کر چلانا بھی جانتا تھا.....

غصے سے ہادی کپکپانے لگا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور کھوہ کی دیواروں کو ٹٹول کر باہر نکلنے کی جدوجہد کرنے لگا۔ تین بار وہ طلال سے ہی ٹکرا کر گر گیا اور ہانپنے لگا۔ وہ ذہنی مریض تھا، آسانی سے سوئی میں دھاگہ تک نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس کا ارتکا ز منتشر ہو جاتا تھا۔ سامنے پڑی چیز مشکل سے دکھائی دیتی تھی۔ اب وہ کان سے نکل کر، موت سے بھاگ کر زندگی تک کیسے چلا جاتا۔

وہ کھوہ سے باہر نکل گیا۔ پھر اس کے قدموں کی چاپ دُور سے سنائی دینے لگی۔ وہ خود ہی نہیں جانتا تھا کہ وہ ایک ہی جگہ کا دس بار چکر لگا چکا ہے۔ اس کی سانس اس کا ساتھ چھوڑ رہی تھی۔

”مجھے یہاں سے باہر نکالو۔ کوئی ہے..... میری مدد کرو.....“ زمین پر گر کر وہ سسکتے ہوئے چلانے لگا۔

ابراہیم سچے جھوٹے ملاوٹ بھرے انداز سے مسکرا دیا۔ وہ انہیں کان میں اتنی دُور لے آیا تھا کہ اس حصے میں چھوٹا سا دھماکا بھی کر دیا جاتا تو اس دھماکے کی آواز باہر کسی انسان کو سنائی نہیں دے سکتی تھی۔ پہاڑوں کے اوپر آوازیں گونجتی ہیں لیکن پہاڑوں کی تہوں میں آوازیں دم توڑ دیتی ہیں۔

”میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔“ بہت وقت بعد ہادی کھوہ تک واپس آنے میں کامیاب ہو پایا تھا۔ وہ گڑ گڑا رہا تھا۔

”کیوں؟ مرنے کا ارادہ بدل دیا ہے؟“ ابراہیم پھر طنز سے ہنس دیا۔

”مجھے یہاں سے نکالو.....“ اس نے اپنے سر کو دیوار پر دے مارا۔ ”خدا کے لیے مجھے یہاں سے نکالو۔“ وہ رونے لگا۔

”اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں نے لائٹر پھینک دیا ہے۔ اگر میں بھی چاہوں تو یہاں سے نہیں نکل سکتا۔ میں نے تمہیں اور خود کو پوری

طرح سے موت کے حوالے کر دیا ہے۔ اب پرسکون رہو۔ جو تھوڑی بہت انرجی بچی ہے وہ بھی ختم ہو جائے گی اور ہم میں بولنے کی سکت بھی نہیں رہے گی۔ غنودگی ہی ہم پر موت طاری کر دے گی اور پتا بھی نہیں چلے گا۔ تم کیا کہتے ہو طلال..... طلال..... طلال؟“

ہادی نیم دیوانہ سا ہو کر طلال کو ٹٹولنے لگا۔ ”کیا وہ مر گیا..... اتنی جلدی..... اتنا خوش نصیب.....؟“
اس کی ناک پر ہاتھ رکھا تو سانس چل رہی تھی۔ ”طلال..... طلال.....؟؟“ اس نے جھنجھوڑ کر اسے اٹھایا۔
”دفغان ہو جاؤ کتوں..... سکون سے مرنے تو دو.....“

”ہمیں یہاں سے نکلنا چاہیے.....“ ہادی چلایا۔ ”ایسے یہاں ہم جلدی نہیں کریں گے۔ بہت سسکنا پڑے گا۔“
ابراہیم نے قہقہہ لگایا۔ ”اب تم ڈر رہے ہو..... ہے نا؟ موت کوئی بٹن نہیں ہے کہ دبایا اور زندگی آف ہو کر موت آن ہو گئی۔“
”بکواس بند کرو اپنی۔ سمجھے۔ تمہاری بات مان کر میں نے غلطی کی۔ میں مرنا چاہتا ہوں لیکن یہ اندھیرا..... یہ اندھیرا.....“
اندھیرے کی چادر پر اس کے گھر کی تصویریں بننے لگی تھیں۔ ماں چاول پھلک رہی تھیں۔ چھوٹی سہیلیوں کے ساتھ اسٹاپو کھیل رہی تھی۔ آپا بالوں میں مہندی لگا کر دھوپ میں بیٹھی تھیں۔ ابا شہر سے اس کے لیے پتنگیں اور ڈوریں لائے تھے۔ وہ پتنگوں کا تاوا ڈوروں کی تندی مانجا چیک کر رہا تھا۔

پھر مانجا لگی ڈور اس کی گردن پر پھر گئی۔ اس نے دلخراش چیخ ماری۔ اسے اسی لیے اندھیرے سے خوف آتا تھا۔ اندھیرا بڑا چال باز اور بہرو پیا تھا۔ کبھی ماں جی بن جاتا کبھی ابا جی..... کبھی نومبر کی دھوپ میں ڈھل جاتا کبھی خون میں..... ہر طرف خون میں.....
ابراہیم کو سانپ سونگھ گیا.....

”مجھے یہاں سے باہر نکال لو۔ تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔ میں کل تک نہیں مروں گا۔ میں دو دن تک اندھیرے کا بو جھ نہیں اٹھا سکتا۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں اس کے یہ وار نہیں سہہ سکتا.....“
وہ باقاعدہ گڑ گڑانے لگا تھا۔ نمک کی قلمیں اس کے آنسوؤں کی تڑپ پر ایک ایک کر کے گرنے لگیں۔ زمین کی ساری بلندیاں اوپر رہ گئیں تھیں اور وہ زمین کی تہوں سے لگا تڑپ رہا تھا.....
”مجھے باہر جانا ہے۔“

طلال کی سسکی ابراہیم کے گہرے سانس کے ساتھ جا ملی تھی۔ پہاڑوں کی تہوں کے سناٹوں نے زندگی کے شور کو اجاگر کر دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ پہاڑوں کی کھوہ اور غاروں میں لمبے عرصے تک خاموشی رہے تو وہاں پر یاں اترتی ہیں۔ ورنہ جن۔ ورنہ موت کے فرشتے..... یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان جگہوں کی تنہائیوں میں حکمت اترتی ہے..... درویشی..... اللہ سے قربت کے امکان..... الہام اور پیغام.....



لاٹروہ پھینک چکا تھا۔ ان کے جسموں سے آدھی جان ویسے ہی نکل چکی تھی۔ ٹٹول ٹٹول کر چلتے ہوئے، کان سے باہر نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ تین چار گھنٹوں میں ہی بالکل آدھ موئے ہو چکے تھے۔ ان میں ایک دوسرے سے بات کرنے کی ہمت بھی نہیں رہی

تھی۔ انہیں یہ سمجھنے میں بھی وقت نہیں لگا تھا کہ اب وہ اس کان سے مر کر بھی نہیں نکل سکتے۔ انہیں ایسے ہی سک سک کر یہیں مرنا ہو گا..... ادھ موئے ہو کر وہ زمین پر گر گئے۔

”کیا ہوا ہے تمہیں؟“

آواز ان کے قریب سے آئی۔ صحرائیں بھٹک جانے والے سیراب کا شکار ہوتے ہیں۔ انہیں جگہ جگہ نخلستان دکھائی دیتے ہیں۔ پانی، آبشار، پھل اور سبز باغ۔ وہ بھی سیراب کا شکار تھے اسی لیے انسانی آواز سن رہے تھے۔

ہادی نے اپنے سر پر ہاتھ کا لمس بھی محسوس کیا۔ ”پاس لگی ہے؟“

روشنی کی کرن اس کی آنکھ کے قریب آئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سفید ڈاڑھی اور لالٹین کی پیلی روشنی پر اس کی نظر پڑی، جس نے لمحہ بھر کے لیے اسے اندھا کر دیا۔

”یہ لو پانی پیو۔“

وہ بے یقینی سے پانی کی بوتل کو دیکھ رہا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے بوتل پکڑ لی۔ اس کے غناخت پانی پینے کی آواز پر اوندھے منہ گرے طلال نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پھر ابراہیم نے۔ طلال نے بوتل اس کے ہاتھ سے جھپٹ لی۔ لالٹین ان کے پاس رکھ کر وہ اور پانی لینے چلے گئے۔

”یہ کھالو.....“ انہوں نے دودھ اور کھجوریں ان کے سامنے رکھ دیں۔ سہارا دے کر وہ تینوں کو اپنی کھوہ تک لے آئے تھے۔

ہادی نے دودھ کے پیالے کو منہ سے لگالیا۔ طلال، ابراہیم کھجوریں کھانے لگیں۔ چھوٹی سی کھوہ تھی۔ ہر طرف پیال بچھی تھی۔ دیوار سے ایک لالٹین لٹک رہی تھی۔ کونے میں جائے نماز بچھی تھی، جس پر بیٹھ کر باباجی نے قرآن پاک کھول لیا تھا۔

”یہاں کیا کر رہے تھے؟“ اپنی منزل ختم کر کے قرآن کو جز دان میں لپیٹتے ہوئے انہوں نے ہادی اور طلال سے پوچھا۔

”مرنے آئے تھے.....“ جواب ابراہیم نے دیا۔

”پھر پانی کیوں پیا.....؟“ ترمی، شفقت اور اطمینان..... مسکراہٹ میں سب کچھ تھا۔

”ایسے تڑپ تڑپ کر نہیں مرنا چاہتا۔“ ہادی کو خود معلوم نہیں تھا کہ پھر پانی کیوں پیا۔ باہر جانے کی تمنا کیوں کی۔

”جب تک انسان زندہ رہے، اسے بس زندہ رہنے کے لیے تڑپنا چاہیے۔“

”مجھے باہر جانا ہے۔“ ان کا پانی، دودھ، کھجوریں کھا کر ان کا شکریہ ادا کیے بغیر وہ انہیں حکم دے رہا تھا۔

”چلے جانا..... مجھے کچھ وقت دو پھر میں تمہیں چھوڑ آؤں گا۔“

اُٹھ کر وہ مٹی کی صراحی سے پانی نکال کر وضو کرنے لگے۔ ہادی نے بے چینی سے پہلو بدل کر انہیں دیکھا۔

رات کا تیسرا پہر..... اللہ سے کلام کا پہر.....

کعبے کی طرف رخ کر کے وہ اذان دے رہے تھے۔ پہاڑوں کی تہوں کے سنائے اس آواز پر فدا تھے۔ ہر شے، ہر سماعت، مہبوت

تھی۔ ہر سانس اس بلاوے کی حیات میں نمودار ہونے کے لیے بے قرار تھی..... سوائے انسان کے..... سوائے ان تین کے.....
 ”نماز کے لیے وضو کرلو۔ ایسی جگہوں پر نماز نصیب والوں کو نصیب ہوتی ہے۔ پھر میں تمہیں باہر لے جاؤں گا۔“
 وہ تینوں سمجھ چکے تھے کہ انہیں نماز پڑھنی ہی ہوگی ورنہ وہ انہیں باہر کا راستہ نہیں دکھائیں گے۔ سلام کے بعد انہیں یاد آیا کہ کل اس وقت وہ زندگی کو قضاء کرنے کے لیے نکلے تھے..... فجر کے وقت..... اور آج اسی وقت وہ نماز فرض ادا کر چکے تھے.....
 ”باہر جانا ہے تو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔“ دعا مانگ کر آمین کہنے کے بعد انہوں نے مصلیٰ پر بیٹھے بیٹھے ان کی طرف رخ موڑ کر کہا۔

”کہ ہم مرنے کا خیال دل سے نکال دیں۔“ ہادی تلخی سے ہنسا۔
 ”موت کے خیال کو دل میں رکھو، بلکہ پختہ رکھو..... موت بری شے تو نہیں.....“
 ”تو پھر.....؟؟؟“ ہادی نے اپنی ناگواری چھپانے کی ذرا سی کوشش بھی نہیں کی۔
 ”تو پھر.....“ ان کے چہرے کی شفقت معدوم ہونے لگی۔ ”تو پھر یہ کہ میں تمہاری مدد کیوں کروں؟ کس لیے.....؟؟“
 ہادی گڑبڑا گیا۔ اس نے چور نظروں سے دونوں کو بھی دیکھا۔
 ”اے معاف کر دیں۔ ہماری مدد کریں پلیز۔“ طلال نے ڈرتے ڈرتے کہا۔
 ”میں مدد کروں گا..... بدلے میں تم مجھے کیا دو گے؟؟“
 تینوں کو سانپ سونگھ گیا۔ ”کیا لیں گے آپ؟“ ابراہیم نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔
 کچھ دیر تک وہ خاموش رہے۔ پھر کونے سے چمڑے کا ایک تھمیا اٹھالائے۔
 ”یہ میرے پاس کسی کی امانت ہے، اگر تم اس تک پہنچا دو تو مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا۔ پھر جو چاہے کرنا۔“
 تینوں نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ہادی نے جھجکتے ہوئے تھیلے کی طرف ہاتھ بڑھا دیئے۔
 ”ہم آپ کا یہ کام کر دیں گے..... انشاء اللہ.....“ یقین دہانی کروانے میں ابراہیم نے پہل کی تھی۔



”آپ یہاں کیا کرتے ہیں؟؟“ ہادی کھوہ سے نکل کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اسے اچانک یاد آیا تو ذرا سا اندر ہو کر پوچھنے لگا۔
 ”میں اکثر یہاں عبادت کے لیے آتا ہوں.....“ وہ لائین میں تیل ڈال رہے تھے۔
 ”یہاں..... اتنی دُور.....؟؟؟“

”ہاں..... اتنی دُور..... اللہ کے اتنے قریب.....“

ہادی کا دل سکڑ گیا۔ اس کی تہجد گزراں بھی کچھ ایسی ہی باتیں کیا کرتی تھی۔
 ”تہجد کی نمازوں کی توفیق بہت خاص لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔“ ہادی کے قریب آ کر اس کے شانے پر تھپکی دے کر کہا۔ لائین

والا ہاتھ اوپر کیا اور خود آگے ہو کر انہیں اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ کچھ دیر تک وہ تنگ راہریوں سے گزرتے رہے۔ پھر نسبتاً کھلے حصے میں آگئے۔ ایک دم باباجی نے پلٹ کر لائین کی روشنی کا رخ ان تینوں کے چہروں کی طرف موڑ دیا۔ لائین ان کے ہاتھ میں جھولنے لگی۔ ان کے چہرے روشنی کے ہالے میں جلنے بجھنے لگے.....

”تم میری آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتے۔ یہاں سے باہر جاتے ہی تم کسی بلندی سے کود جاؤ گے اور تم اپنی نبض کاٹ لو گے۔“ وہ ہادی اور طلال سے مخاطب تھے۔

ہادی کے پیر زمین نے جکڑ لیے۔ اس کی سانسوں پر گرہیں لگنے لگیں تھیں۔ طلال تیزی سے ناخن چبانے لگا۔

”م.....م.....“ ہادی نے بڑی بے بسی سے باباجی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے پاگل پن پر کڑا وقت آیا تھا۔

”وعدہ کرو مجھ سے.....“ کہتے کہتے وہ رک گئے اور گہرا سانس لیا۔ ”انسان کی نیت ہی ٹھیک نہ ہو تو وعدے، حلف، عہد بھی دو کوڑی کے ہو جاتے ہیں۔ ان کی حیثیت ہی کیا رہتی ہے بھلا.....“

”میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کا کام کرنے کی پوری کوشش کروں گا.....“ ہادی کی زبان اس کی نیت کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

”اس امانت کا امانت دار تک پہنچنا بہت ضروری ہے۔ مجھ میں اتنی سکت نہیں کہ اکیلا یہ سب کر سکوں۔ مجھ پر یہ احسان کر دو..... اللہ تم سے خوش ہو گا۔“ لائین زمین پر رکھ کر انہوں نے ان کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے.....

ابراہیم نے جلدی سے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ تھام لیے۔ ”میں آپ کے اس کام کی تکمیل کا وعدہ کرتا ہوں.....“

”شکریہ تمہارا.....“ او میرے ساتھ.....“ سر ہلا کر وہ مسکرائے۔

چھوٹے سے پل سے گزر کر انہیں روشنی کی لکیر دکھائی دینے لگی تھی۔ کان کی انتظامیہ کی آوازوں کی بھنھنا ہٹ واضح ہوتی جا رہی تھی۔ تینوں نے بیک وقت گردنیں موڑ کر پیچھے دیکھا اور باباجی کو مسکرا کر ہاتھ ہلاتے ہوئے پایا.....

جیسے کوہ پیاں آگے پیچھے بلندی کی طرف سفر کرتے ہیں، ویسے ہی وہ آگے پیچھے سفر کر رہے تھے۔ رات گزر چکی تھی۔ دن نکل آیا تھا۔ وہ اس کڑے سفر اور لمبی کان سے باہر نکلے تو ہادی نے سب سے پہلے روشنی کو محسوس کیا..... روشنی جو زندگی کی سانس ہے۔ طلال نے کرکٹ کھیلتے، شور شرابا کرتے بچوں کو..... بچے جو اس حقیقت کی طرف اشارہ ہیں کہ ایک اور نئے جہاں کی بنیاد رکھی جا چکی ہے۔ ابراہیم نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف.....

آسمان جس کی وسعت گواہ ہے کہ انسان پر اللہ کی رحمت بے حساب ہے.....



چھوٹی بڑی پہاڑیاں کو دیکھنا کہ وہ بلندی پر پہنچ چکے تھے۔ طلال نے پانی کی بوتل سے سر کو گیلیا کیا اور بالوں کو جھٹکنے لگا۔ پھر وہ ایک لمبے درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ ہادی دونوں ٹانگیں پھیلا کر ایک اونچے پہاڑی ٹیلے پر بیٹھا ہوا تھا۔ چھلانگ لگا کر ابراہیم بھی اس کے پاس جا پہنچا اور ذرا نیچے ہو کر بیٹھ گیا۔ بہت دیر تک تینوں خاموشی سے دُور تک پھیلے پہاڑی سلسلوں کو دیکھتے رہے۔

زبان کے نیچے دونوں انگلیاں پھنسا کر ابراہیم نے پورا زور لگا کر سیٹی ماری۔ اس کی سیٹی کی گونج صبح کی پو کے ساتھ بڑی بھلی لگی۔ نیچے سے ہوٹل کے چھوٹے نے اوپر نہیں دیکھا۔ اور جلدی سے ان کے لیے تین کپ چائے اور تلوں والے مان لے آیا۔ نان توڑ توڑ کر چائے میں ڈبو ڈبو کر کھاتے، تینوں ٹوٹے پھوٹے بلے کے ساتھ کرکٹ میچ کھیلتے بچوں کو دیکھتے رہے۔ اسکو رکرنے کے لیے، میچ جیتنے کے لیے وہ سر دھڑکی بازی لگا رہے تھے۔ ہار کوئی بھی ہو، خاطر میں نہیں لانی چاہیے۔ جیت کوئی بھی ہو سر دھڑکی بازی لگا دینی چاہیے.....

جس وقت وہ کار میں بیٹھے اس وقت ایک چھوٹا سا بچہ نمک سے بنیں چیزوں کی ٹوکری کھڑکی کے سامنے لایا اور مسکرا دیا۔ ”بچے سے کچھ لے لو یا را!“ ابراہیم نے گردن موڑ کر ان دونوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ یہ پہلی بات تھی جو کان سے نکلنے کے بعد اس نے کی تھی۔

ہادی نے ایسے ہی ہاتھ بڑھا دیا، بچے نے اس کی طرف نمک سے بنا ”شاپین“ بڑھا دیا۔ طلال کی سمت ”سفید پھول“ اور ابراہیم کی طرف اپنی مسکراہٹ اور ایک ”خنجر“۔ تینوں نے اپنی چیزیں غیر ارادی طور پر اپنی جیبوں میں رکھ لیں..... اور..... موت کا سلسلہ..... زندگی پانے کے لیے شروع ہو گیا.....



گوجرانولہ اڈے پر کار روک کر ابراہیم نے چائے کے ہوٹل سے امام دین کے بارے میں پوچھا۔ باباجی نے کہا تھا کہ اڈے کے ہوٹل سے ہی اتا پتال جائے گا۔

”انہیں بھولو کے گھر لے جاؤ۔“ ہوٹل کے مالک نے چھوٹے کو آواز دے کر کہا۔

”بھولو نہیں امام دین سے ملنا ہے.....“ ہادی کی آنکھوں نے چائے پھینٹتے چائے والے کے ہاتھوں کی ”بلندی“ کا تعاقب کیا۔

”گوجرانولہ میں کسی بھی بندے کا پتا کرنا ہو، بھولو کی حویلی سے ہی نشان ملتا ہے۔ چڑی کے بوٹ اور پہلوان کے لنگوٹ کا بھی۔“

ابراہیم کی ہنسی نکل گئی۔ چھوٹا فرنٹ سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔

بازار میں رش بہت تھا، اور وہ ہارن دے دے کر تھک چکا تھا۔ نہ ہی بھیڑ ہارن پر راستہ دے رہی تھی، نہ کھڑکی سے نکلے اس کے ہاتھ کے اشاروں پر۔ (منت سماجت) آدھے گھنٹے سے کار بازار میں پھنسی ہوئی تھی۔

”یار کوئی اور راستہ نہیں تھا وہاں جانے کے لیے.....“ ابراہیم نے مستقل ہارن پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ ایک ماں جی نے ونڈ شیڈ کی

طرف ہاتھ سے لعنت کے اشارے اور دو چار دس بارہ گالیاں ارسال کیں تو اس نے ہڑبڑا کر ہارن سے ہاتھ ہٹا لیا۔

لڑکا اپنا سر کھجانے لگا۔ ”تھا تو..... پر میں نے سوچا آپ ذرا بازار کی سیر بھی کر لیں گے..... نئے ہیں نا اس شہر میں۔“

ہادی نے پیچھے سے بچے کے پیچھے جیسے بالوں کے گچھے میں ہاتھ پھنسا کر کھینچا۔ ”ہمیں سیر کروانی تھی یا خود کرنی تھی..... ویسے گھر

والے تمہیں کیا کہتے ہیں..... بندریا بندر؟؟“

”جی باندرا..... پر آپ کو کیسے پتا چلا جی.....؟؟“

”تمہاری اس کھجلی سے..... جو پورے جسم میں پھیلی ہوئی اور دونوں ہاتھوں سے کھجانے پر بھی ختم نہیں ہو رہی۔“

وہ کھی کھی ہنسنے لگا۔ ”بس جی کیا کریں‘ شکر ہے اللہ کا..... وہ جس حال میں رکھے.....“

”پانی گرم کر کے رگڑ رگڑ کر نہانے کے بعد کے حال میں آ کر دیکھو..... ساری مخلوق تمہیں دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کرے گی۔“

”یا اللہ تیرا شکر“ ابراہیم نے بروقت بریک پر پاؤں کا دباؤ ڈالا تھا۔ ورنہ سمو سے والے کی گرم تیل کی کڑا ہی اور آلو چنے والے کی

ریڑھی مل ملا کر الٹ جاتیں۔ اور پورے بازار میں کہرام برپا ہو جاتا..... ساری نانیاں دادیاں اسے کوششیں۔

”بڑی اچھی سیر ہو گئی ہماری بازار کی..... شکریہ آپ کا باندرا جی!“ اس نے اسٹرنگ پر سر کو گرا لیا اور ترچھی نظر سے چھوٹے کو گھورا۔

”بس جی وہ رہی سامنے حویلی.....“ اس نے کمر اور پیٹ کو ایک ساتھ کھجاتے ہوئے کہا۔

”وہ تمہیں بس سامنے نظر آرہی تھی؟ آنکھوں میں دو رہیں فٹ ہے؟؟“ طلال نے دور بہت دور حویلی کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر دیکھا۔

”کار سے نکلیں جی..... اڑ کر پہنچ جائیں گے..... آپ نکلیں تو سہی.....“

”کیوں کار سے نکلتے ہی ہم راکٹ بن جائیں گے.....؟؟“ ہادی نے اس کے بالوں کے گچھے میں ہاتھ ڈالا تھا۔ اب وہ ہاتھ

آرام سے نہیں بیٹھ رہا تھا..... بازو کھجا رہا تھا.....

تینوں راکٹ کار سے نکلے تو چھوٹا تیزی سے پیچھے کی طرف بدکا.....

”آگے آپ خود ہی چلے جائیں۔ میری ٹانگوں میں ویسے ہی جان نہیں ہے۔ پچھلی پچاس ڈنڈ بیٹھکیں ابھی رہتی ہیں۔ جرمانے کی

ساٹھا لگ سے۔ موٹو گنتی میں بے ایمانی بھی بڑی کرتا ہے۔ نا بابانا..... تسی جاؤ جی.....“ بندر کی طرح چھلانگیں مارتا باندرا بازار کے ہجوم میں

غائب ہو گیا۔

لال اینٹوں کی حویلی کا بڑا سیاہ پھانک کھلا ہوا تھا۔ پھانک پر ایسے آنا جانا لگا ہوا تھا جیسے اندر رس گئے اور جلیبیاں مفت تقسیم کی جا

رہی ہوں۔ لسی، فالودہ، اور ساتھ دس دس کے نوٹ بھی..... پھانک کی دو سیڑھیاں چڑھ کر ہادی نے سر اندر کی طرف ترچھا کر کے جھانک کر

دیکھا۔ اسے ہلکا سا ایک جھٹکا لگا۔ اس کی پشت سے سرو اونچا کر کے ابراہیم نے جھانکا۔ پھر طلال نے جس نے بڑی بے نیازی سے پیٹ کی

جیبوں میں دونوں ہاتھ دینے ہوئے تھے۔

اندر بڑا سا..... بہت ہی بڑا سا اکھاڑا تھا اور وہاں ڈنگل ہو رہا تھا..... مٹی کے میدان میں گوشت کے پہلوان ایک دوسرے کو ٹنچ

کر زمین پر دے دے کر مار رہے تھے۔ اس پاس کچھ بچے بڑے بوڑھے، کھڑے، بیٹھے تماشا دیکھ رہے تھے۔ ہنسی ٹھٹھولے، مذاق، مذاق

رات سب چل رہا تھا۔ ایک طرف ہر عمر ہر ساخت ہر رنگ کے بچے بچیاں ترتیب سے آگے پیچھے کھڑے ڈنڈ بیٹھکیں لگا رہے تھے اور ایک

چھوٹا پہلوان نما بچان کی نگرانی کر رہا تھا۔ وہ کچھ ایسے گنتی گن رہا تھا.....

”تاڈے اٹھائیس۔ ساڈے اٹھائیس..... کچا اٹھائیس..... پکا اٹھائیس..... ہون ہو یا پورا اٹھائیس۔“

تاڈا پہلو ان‘ ساڈا پہلو ان‘ کچا‘ پکا‘ پونا‘ پورا پہلو ان..... انہوں نے زندگی میں بھائی جان تو بہت دیکھے تھے لیکن ”پہلو ان“ پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ وہاں ادھر ادھر دائیں بائیں اوپر نیچے اتنے پہلو ان تھے..... اتنے کہ..... کہ ان تینوں کو ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ ”انسان لینڈ“ سے نکل کر ”پہلو ان لینڈ“ میں آچکے ہیں۔ دنیا میں اب کہیں کوئی انسان باقی نہیں بچا ہوگا..... نہ چاند پر..... نہ مریخ“ مشتری“ پلوٹو وغیرہ پر۔

”وہ بھولو کہاں ہے؟“ قریب سے گزرتے ایک آدمی سے ہادی نے پوچھا۔ تینوں پھانک سے اندر آچکے تھے۔

آدمی رکا اور کھینچ کر ایک تھپڑ ہادی کے گال پر رکھا۔

”تیرے ساتھ کھیلتا رہا ہے بھولو..... تیرا ”بھالو“ ہے بھولو..... اپنے باپ کی عمر کے لوگوں کو ایسے بلاتا ہے تو۔“

اسے کیا پتا تھا کہ وہ اس کی باپ کی عمر کے ہیں.....

کچھ چیز اتنی کڑک دار تھی کچھ آدمی کی آواز ایسی دنگ دار تھی کہ اکھاڑے کے سارے پہلو ان اپنا اپنا کام (مار کٹائی) چھوڑ کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔ دیواروں پر بیٹھے سارے کوئیں ایک دم سے اُڑ گئے۔ ڈنڈ بیٹھکیں لگاتے بچے رک گئے ان کے دانت خواہ مخواہ نکل آئے۔ ساڑے، تاڈے، کچے، پکے کرتے پہلو ان، بے ایمان بچے کی گردن پوری ان کی طرف گھوم گئی۔

پہلو انوں کی بھیڑ میں سے ایک گرج دار آواز گونجی۔ ”کون ہیں یہ؟؟؟“

”پتا نہیں پہلو ان جی کون ہیں..... کہتے ہیں ”بھالو بھولو“ کہاں ہے؟ دیکھو ذرا.....“

دیکھو ذرا..... حیرت سے ان تینوں کی آنکھیں ساکت ہو گئیں۔ طلال جو دیوار کے سہارے ایک پاؤں لٹکا کر کھڑا تھا، لڑکھڑا کر گرتے گرتے رہا۔ کھڑے کھڑے بھاء چپڑ نے کیسے جھوٹ گھڑ لیا تھا۔

”بھالو..... بھاء کو بھالو کہا.....“ یہاں وہاں ادھر ادھر آگے پیچھے دائیں بائیں ہر طرف ”بھالو بھالو“ ہو گیا۔

”لاؤ اوے ذرا انہیں ادھر..... کھوتے او توں کھوتے.....“

جو جھوڑا بہت شور شرابا تھا بھی وہ اس آواز کے بلند ہوتے ہی کنویں کی تہہ ہو گیا۔ کھوتے کھوتے ذرا سا ہم گئے۔ ادھر آؤ کی بجائے بھولو نے کہا تھا۔ ”لاؤ انہیں ادھر“۔ ابراہیم معذرت کرنا ہی چاہتا تھا کہ کوئی تین چار دس بارہ ہاتھ ادھر ادھر سے آئے اور جیسے بینگر میں کپڑے ہنگ ہوتے ہیں ویسے انہیں اپنے بازوؤں میں ہنگ کر کے ”بھولو“ کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔

”کیا کہا مجھے؟؟؟“ لکڑی کی کرسی پر کمر سیدھی رکھ کر بیٹھے ”بھولو“ نے سینے پر ہاتھ باندھ کر پوچھا۔

”مجھے پتا نہیں تھا آپ پہلو ان ہیں.....“ سب سے آگے ابراہیم ہی کھڑا ہوا تھا۔ سانس بھی اس کا ہی خشک ہو رہا تھا۔

”جو پہلو ان نہیں ہوگا اس کی عزت نہیں کرو گے؟“ وہ ابراہیم کی پشت کا سہارا لینے والے ہادی سے پوچھ رہے تھے۔

”سوری! پتا نہیں تھا کہ آپ عمر میں بڑے ہیں.....“ ہادی نے سر کو کھجایا پھر کان کو..... پھر ٹھوڑی کو..... باندرا اپنی بیماری پوری

ایمان داری سے اسے عطیہ کر گیا تھا..... وہ بھی مفتوں مفتی.....

”جو عمر میں چھوٹا ہوگا اسے بے عزت کرو گے؟؟“

ہادی کا سر چکرا گیا۔ ”وہ دراصل ہمیں امام دین سے ملنا ہے.....“ طلال نے اپنی طرف سے بات کو سنبھالنا چاہا.....
 ”امام دین تیرا ر ہے؟؟؟ چاچا و چاچا ساتھ لگاتے موت پڑتی ہے۔“ بات سنبھل گئی..... کھری کھری سننے کے لیے مل گئیں۔
 ”ہمیں چاچا امام دین سے ملنا تھا۔“

تینوں ہی گھبرا، گھگھیا، تتھلا گئے۔ سارا ہجوم ان تینوں کو دیکھ رہا تھا۔ بھولو پہلوان کی بات پر سارا مجمع بیک وقت سر کو ”ہاں“ میں ہلاتا تھا۔ ان کے جواب پر سر گھما کر انہیں گھورتا تھا..... یہ تو کھلا تضاد ہوا.....

”چاچے سے بھی مل لینا، پہلے اپنے مامے سے ملو..... بھالو مامے سے.....“ بھالو مامے نے اپنی بانہیں ان کی طرف پھیلا دیں۔ پیچھے سے کسی پہلوان نے ایویں کہنی سے ٹھونکا مارا اور وہ باری باری کرسی پر بیٹھے ”بھالو مامے“ کے سینے سے جا لگے.....
 زندگی میں کچھ واقعات پہلی بار ہوتے ہیں اور بڑے اندوہناک ہوتے ہیں..... آسمانی بجلی کا گرنا، سونامی طوفان کا آنا، پہاڑ کی چوٹی سے گر جانا..... اور پھر پہلوان کے سینے سے جا لگنا.....

ایک ہوتا ہے چولیس مل جانا اور ایک ہوتا ہے جو کچھ تھا سب کا مل ہلا جانا۔ ان کے ساتھ یہ دونوں واقعات وحادثات ہوئے تھے۔



تینوں بیٹھ گئے بلکہ بٹھا دیئے گئے۔ ہادی بھاء بھولو کے کے دائیں، طلال بائیں اور ابراہیم ذرا سا دُور ہٹ (بیچ) کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے گلے لگنے کی صورت ہڈیوں کا کچومر بنوالیا تھا، اب وہ ان پر کالانمک نہیں چھڑکوانا چاہتا تھا۔ احتیاط مار سے بہتر ہوتی ہے۔
 ”کشتیاں دیکھی ہے کبھی؟“ بھاء بھولو نے ہادی اور طلال کے شانے پر اپنا ایک ایک ہاتھ (تھوڑا) رکھتے (مارتے) ہوئے پوچھا۔ ہاتھ پہلوان کا، اور سوال جان کا۔ دونوں نے آہ دبا کر، ناں میں گردن ہلا دی۔
 ”اب دیکھو..... چلو میرے پہلوان بچوں شروع ہو جاؤ۔“

پہلوان بچوں نے رکا ہوا ڈنگل پھر سے شروع کر دیا۔ کوئی تیس، چالیس کے قریب پہلوان کھڑے تھے، جو ایک ایک کر کے کشتی لڑنے لگے تھے۔ ان کے لیے اندر سے لسی کے گلاس (بالٹیاں) آنے لگیں۔ پھر پیڑے، پھر دودھ جلیبی..... پھر..... پھر.....
 وہ ایک عرصے سے دوائیوں پر زندہ تھے۔ ان کے جسم نارمل نہیں رہے تھے۔ وہ تھوڑا بہت یا زیادہ کچھ بھی نہیں کھا سکتے تھے۔ ان کے معدے ناتواں ہو چکے تھے۔ ہادی کھاتا جا رہا تھا، اور ابکیاں کرتا جا رہا تھا۔ بھاء پھر بھی باز نہیں آ رہا تھا۔ انہیں زبردستی کھلاتا جا رہا تھا۔ نالسی ختم ہونے میں آرہی تھی ناکشتی۔

”رستم زماں غلام محمد گاما پہلوان کو جانتے ہونا..... یہ نہ کہنا کہ نہیں جانتے، ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“

براہوا کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے..... انہیں ضرورت ہی کیا پڑی تھی، اپنے علاوہ کسی اور کی خبر رکھنے کی۔

”تم نئے زمانے کے لوگ، اپنے ہیرووں کے بارے میں جان کر کرو گے ہی کیا۔ بروں لی کو تو جانتے ہی ہو گے، جس کے نام کا ڈنگا

آج بھی چار عالم میں بجتا ہے۔ وہ بروں لی ہمارے رستم زماں گاماں پہلوان کا بہت بڑا مداح تھا۔ اپنا استاد ماننا تھا رستم زماں کو۔ ان جیسی ورزشیں کرتا تھا۔ بہت کچھ سیکھا تھا اس نے ان سے۔ اب کچھ قدر ہوئی تمہاری نظر میں بھاء گاماں کی؟“

تینوں شرمندگی سے نظریں چرانے لگے۔

”باکیس سال کی عمر میں رستم زماں بھاء گاماں نے بارہ سو کلو وزنی پتھر اٹھا کر، سینے تک لا کر چند قدم چل کر ساری دنیا کو حیرت سے بت بنا دیا تھا۔ یہ پتھر آج بھی انڈیا کے میوزم میں رکھا ہوا ہے۔ بارہ سو کلو جانتے ہو کتنا ہوتا ہے؟“

طلال نے سر ہلادیا..... ”تمیں، بتیس آدمی مل کر اٹھائیں تو شاید اٹھایا جائے..... ورنہ کوئی کرین وغیرہ.....“

بھاء نے سر ہلایا اور سارے مجمع کی طرف دیکھا۔ ”انسان کے جسم میں اتنی طاقت ہے تو روح میں کتنی ہوگی؟ کیونکہ روح جسم سے افضل ہوتی ہے۔ بڑے سے بڑا نعم اور تکلیف سہہ جاتی ہے۔ تو بس روح کو افضل رکھو..... روح کی طاقت ہی اصل طاقت ہوتی ہے۔ حقیقی پہلوان، پہلوانی داؤ، اور درویشی صفت سے جیتتا ہے۔ جس کی روح افضل ہے، اسے کوئی نہیں ہرا سکتا۔ سمجھ گئے سب؟؟“

سب نے بیک وقت ”سمجھ گئے جی.....“ کا نعرہ بلند کیا۔

لبے برآمدے سے گزر کر وہ حویلی کے سرخ اینٹوں والے کھلے احاطے میں آ کر بیٹھ گئے۔ تخت پر نیم دراز ہو کر بھاء نے اپنے دونوں بازو ہادی اور طال کی طرف بڑھا دیئے۔

”اکڑ گئے ہیں..... ذرا دم لگا کر دانا.....“

”وہ جی امام دین، میرا مطلب چاچا امام دین.....“ ہادی نے ابرو اچکا کر ابراہیم کی طرف سوالیہ دیکھا تو ابراہیم نے سوال کر دیا۔

”آ جاتے ہیں وہ بھی۔ ہمارے ہی مہمان ہیں چاچے ہو ری۔ اوئے کا کے ہادی! انسان بن، ذرا جان لگایا!“

”ٹھیک ہے پھر آپ ان کی یہ امانت انہیں دے دیں۔ ہم چلتے ہیں۔“ ابراہیم نے چمڑے کا تھپا بھاء کی طرف بڑھا دیا۔

”میں تمہارا میزبان ہوں، تمہارا کمی نہیں۔ خود دینا امام دین کو۔“

”کب تک آ جائیں گے وہ.....؟؟“

”آ جائے گا..... آ جائے گا..... مجھے ذرا اونگھ آرہی ہے..... سو جاؤں تو مغرب کے وقت اٹھا دینا.....“

ہادی نے جھٹکے سے بھاء کے بازو کو چھوڑا۔ ”ٹھیک ہے پھر ابھی ہم چلتے ہیں.....“

بھاء بھولنے ایک نظر اسے دیکھا۔ ”تم شراب پیتے ہو؟؟؟ یہ آنکھوں میں لال ڈورے کیسے ہیں؟“

”آپ کو اس سے کیا مطلب؟“ اب وہ غصے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بد لحاظ اور بے ادب۔

”پتر جی! اپنے خون کی گرمی یہاں سرد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سمجھے؟ میری ساری حویلی بھاں بھاں کریں نا تو بھی آٹھ دس

پہلوان یہاں وہاں سے ایویں ہی نکل آتے ہیں۔ ایسے ٹنچ ٹنچ کر ماریں گے کہ.....“

”اچھا ہیں ماریں، جان سے ہی ماریں۔ بلائیں اپنے پہلوانوں کو۔ بڑی مہربانی ہوگی آپ کی۔“ ہادی کا دودو جواب دینا اور

انگارہ لہجہ بھاء کو بہت برا لگا۔

”یہ مہربانی میں تم پر ضرور کروں گا۔ اوچیرے، اوئے مکھن! ادھر آؤ ذرا۔ لے جاؤ اس کا کے کو اور اسے مہربان ہو کر دکھاؤ۔“
چیرا، مکھن، ملانی، لسی، دودھ، انڈا، پراٹھا سب نکل آئے۔ اسے اٹھا کر لے گئے اور اکھاڑے میں بیچ کر پھینکا۔ ابراہیم نے لاکھ معافی
تلافی کی لیکن بھاء نے آواز لگادی.....

”رگڑ کر رکھ دو اسے..... سارے کس بل نکال دو، کوئی بیچ ڈھیلا نہ رہے.....“

ڈھیلے بیچ کنسے کے لیے بیچ کسوں نے اسے دونوں پیروں سے پکڑ کر الٹا کر دیا اور گول گول گھمانے لگے۔ ابراہیم نے سہم کر بھاء کی
طرف دیکھا۔ پر بھاء آنکھیں موند چکے تھے۔ طلال شرافت سے بھاء کے بازو دبانی میں مصروف ہو چکا تھا۔ دوسرا بازو اب ابراہیم کے
حصے میں آچکا تھا۔ وہ بھی چپ چاپ دبانی لگا اور دوسرا منے اکھاڑے کو نظریں چراچرا کر دیکھنے لگا۔ اتنے پہلوان اور اکیلا ہادی..... جیسے
نہر کنارے کپڑے دھونے والیاں، کپڑوں کو دے دے کر مارتی ہیں۔ پھر تھاپے سے کوٹتی ہیں۔ وہی سلوک پہلوان ہادی کے ساتھ کر رہے
تھے۔ تھاپے کا کام وہ ہاتھوں اور ٹانگوں سے لے رہے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے انہوں نے ”کشتیاں“ دیکھی تھیں۔ اب وہ ”دھینگا مشتیاں“
دیکھ رہے تھے۔

جب انہیں یقین ہو گیا کہ کپڑا اصل کر صاف ہو گیا ہے۔ ساری میل کچل نکل گئی ہے۔ کپڑا انچڑ بھی گیا ہے تو وہ اکھاڑے سے سراسر
بھاء کی طرف کر کے پوچھنے لگے..... ”بس بھاء جی؟“

کیسے ظالم انسان تھے۔ ساڈے، تاڈے، کچے، پکے، آدھے پونے پورے کس بل نکال کر بھی پوچھ رہے تھے ”بس؟“
بس ہی ہو گئی تھی۔ ابراہیم ہادی کی طرف آنے لگا تو آنکھیں موندے پڑے بھاء نے ابراہیم کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”سیانوں کے کاموں میں مداخلت نہیں کرتے۔ پڑا رہنے دو اسے مٹی میں.....“

وہ مٹی میں پڑا رہا۔ جب وہ چھوٹا تھا تو مٹی کے گھوگھوڑے بناتے بناتے ان ہی کے ساتھ سو جایا کرتا تھا۔ آنکھ کھلتی تو اوپر درخت
کی چھاؤں ہوتی اور نیچے سراں کی گودی میں.....

”پتر چار پائی پر سو یا کر.....“

”گھوگھوڑے کہتے ہیں کہ انہیں چار پائی پر نیند نہیں آتی.....“ وہ کچی کچی نیند میں آنکھیں جھپک جھپک کر ماں کو دیکھتا۔ ہاتھ
بڑھا کر ماں کے گال کی چٹکی بھرتا..... ”سو سنی ماں.....“

”شیر پتر..... سو جا شاہاش..... سو جا.....“ وہ پیشانی چومتی، سر تھپکتی، لوری گاتی۔

نہ لوری تھی، نہ تھپکی، نہ ماں اور نہ اس کا دلار۔ آنسو اس کی آنکھ سے نکلے اور وہ غنودگی سے گہری نیند میں چلا گیا۔ وہ تو سو گیا لیکن آنسو
نہیں سوئے۔ وہ اس کے گالوں پر بہتے رہے..... بہتے رہے.....
مائیں فی میں کنوں اکھاں..... در دو چھوڑے دا حال.....

درو چھوڑے دا حال..... تیرے بعد اس جند دا حال.....



نیند کا تعلق جسم سے ہے، اور لاعلمی کا روح سے.....

جو سوتے رہ جاتے ہیں، وہ کھوتے نہیں، ”کھو“ جاتے ہیں۔ (گم ہو جاتے ہیں)

ان دونوں کی چارپائیاں بھاء کے دائیں بائیں تھیں۔ یہاں وہاں ہر طرف پہلو ان ہی پہلو ان سو رہے تھے۔ طلال کروٹ پر کروٹ بدل رہا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی اپنے ساتھ اپنی دوالے کر نہیں آیا تھا۔ جب وہ نکلے ہی مرنے کے لیے تھے تو دوا ساتھ کیوں رکھتے۔ اب اس کے دماغ کا بیمار حصہ پھر سے جاگ رہا تھا اور ڈیپریشن اس پر حملہ کر رہا تھا۔

”سو جا پتر! سو جا.....“ اس کے سینے پر ہاتھ آیا اور بھاء تھکیاں دینے لگے۔

”میں ذرا باہر سے تازہ ہوا کھا کر آیا.....“ وہ بے چینی سے اٹھ کر جانے لگا۔

”تجھے تازہ ہوا کی نہیں تازہ ایمان کی ضرورت ہے۔ اللہ سے شکوے شکایتیں کرو تو بھی ٹھیک ہے، کوئی تعلق تو بنا رہتا ہے۔ پر ایسے

تعلق توڑ دینا ٹھیک نہیں ہوتا جی! اللہ کی ذات پر یقین رکھنا سیکھو۔ جان کو ایک تکلیف ملتی ہے تو سو سکھ بھی تو ملتے ہیں۔“

طلال ان باتوں کو سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے پھر سے اٹھنے کی کوشش کی تو بھاء نے اس کے سینے پر ہاتھ کا دباؤ بڑھا دیا۔

”چیرے اٹھ ذرا!“

بھاء نے ہلکی سی آواز دی تھی، جو یقیناً چیرے نے خواب میں سنی ہوگی۔ اور فوراً حاضر جناب ہو کر بھاء کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا

تھا۔ بھاء نے ہاتھ کا اشارہ طلال کی طرف کیا..... بس..... ابراہیم نے کن اکھیوں سے دونوں کو دیکھا۔ اشارے پر ہی چیرا کو دکر طلال کے سر ہانے بیٹھ گیا اور پیٹ پر ہاتھ رکھ کر اسے چارپائی پر الٹ کر رکھ دیا.....

”یہ..... یہ کیا.....“ طلال کی گھٹی گھٹی آواز نکلی۔

چیرا شاید اب بہرا ہو چکا تھا۔ کسی بات کا جواب نہیں دے رہا تھا۔ وہ اس کی کمر اور ریڑھ کی ہڈی پر چھوٹے چھوٹے ٹکے (بم) مار

رہا تھا۔ اس کے ملکوں کی رفتار اور ترتیب میں اتنا توازن تھا کہ طلال کچھ بولتا تو اس کی آواز ملکوں کی بم ماری میں دب جاتی۔ اس نے ریڑھ کی ہڈی سے لے کر سر تک اسے اچھا خاصا رگڑ کر رکھ دیا تھا۔

”سیانے کہتے ہیں کہ ریڑھ کی ہڈی میں نقص پڑ جائے تو سارے جسم میں نقص پڑ جاتا ہے۔ جس نے ریڑھ کے مہروں کو ٹھیک رکھا،

اس نے سب ٹھیک رکھا۔ اب جا کے سو جا چیرے.....“ بند آنکھوں سے بھاء نے کہا۔ پھر جھک کر طلال کے منہ پر تین پھونکیں ماریں

”میں نے نیند کا دم بھی کر دیا ہے..... تسی وی سو جاؤ ہن.....“

”نیند کا دم..... ہونہ.....“ وہ بڑبڑایا۔

اسے آسمان کے ستارے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ہاسپٹل کا اسٹاف اسے نیند کے لیے بہت ہی وی میڈیسن دیا کرتا تھا پھر بھی

اسے نیند نہیں آتی تھی۔ ایک بار وہ مسلسل چھ دنوں تک جاگتا رہا تھا۔ ڈاکٹر زکا بورڈ ہنگامی میٹنگ کے لیے بیٹھ گیا تھا کہ اگر وہ اب بھی نہیں سویا تو مر جائے گا۔ اور یہ پہلوانی داؤ۔۔۔۔۔ یہ نیند کا دم۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔

آسمان کے ستارے گڈمڈ ہونے لگے تھے۔۔۔۔۔ آنکھ مچولی کھلتے کودتے پھاندتے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب دُور نکل گئے تھے۔



پتا نہیں کیا ہوا تینوں ایکدم سے زمین پر آ کر گرے۔ کتنی ہی دیر تک وہ نا سمجھی سے سر اٹھا کر اپنے سر پر کھڑے جنوں کو دیکھتے

رہے۔۔۔۔۔

”ہم کہاں ہیں۔۔۔۔۔ تم کون ہو۔۔۔۔۔؟؟“ انہیں کچھ بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔

”تم اکھاڑے میں ہو۔۔۔۔۔ اور ہم پہلوان ہیں۔۔۔۔۔“

”آہ۔۔۔۔۔“ انہیں سب یاد آ گیا تھا۔

وہ مہمان تھے تو وہ ان سے نرمی سے پیش آتے رہے تھے۔ انہیں آوازیں دینے، ہلانے جلانے کے بعد وہ ان کے سر ہانے آ کر

کھڑے ہو گئے تھے۔ چار پائیوں کو پکڑ کر کھڑا کر دیا تھا اور انہیں زمین پر الٹ دیا تھا۔۔۔۔۔ پکی اینٹوں کے فرش کی زمین پر۔۔۔۔۔

رات کے کسی پہر ہادی کو بھی کسی پہلوان نے آٹے کی بوری کی طرح کندھے پر لا کر چار پائی پر بٹخ دیا تھا۔ اب وہ تینوں چوٹ

لگے بچوں کی طرح زمین پر ڈھیر تھے۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے۔۔۔۔۔؟؟ ابراہیم نے غصہ دکھانے کی کمزوری کوشش کی۔

”تمیز سے منہ ہاتھ دھو کر اکھاڑے میں آ جاؤ۔۔۔۔۔“

”اپنے مہمانوں کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہو؟ آدھی رات کو چار پائیاں الٹ دیتے ہو۔۔۔۔۔؟؟“

”آدھی رات نہیں تہجد کا وقت ہونے والا ہے۔۔۔۔۔ اٹھ کر اپنے کام بنناؤ۔۔۔۔۔“

ہادی نے بے یقینی سے ابراہیم کی طرف دیکھا۔ ”کام۔۔۔۔۔ کون سے کام۔۔۔۔۔ ہمارے یہاں کون سے کام ہیں بھلا؟؟“

ڈنڈ بیٹھک۔۔۔۔۔ ڈنریل۔۔۔۔۔ دوڑ اور کسرت کے کام۔۔۔۔۔ لیکن اس سے پہلے اکھاڑے کی مٹی کھودنے کا کام۔۔۔۔۔

ان تینوں کو ایک ایک بیلچہ دے دیا گیا اور اکھاڑے کی چکنی مٹی کھودنے پر لگا دیا گیا۔ پہلوانوں کی کشتیوں کی وجہ سے چکنی مٹی جم جایا

کرتی تھی، روز اس وقت اسے کھودنا پڑتا تھا۔ ان تینوں کو اندازہ نہیں تھا کہ پہلوان کا مہمان بن کر انہیں ایسی ایسی قیمتیں (زلیں) چکانی پڑیں

گی۔

پانچ منٹ بعد ہانپ کر ہادی نے بیلچہ نیچے دے مارا۔ ”لیکن ہم یہ کیوں کریں۔۔۔۔۔؟؟“

”بھاء کہتے ہیں جو بس سوال ہی کرتا رہ جاتا ہے وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ جو سر جھکا کر مان لیتا ہے وہ پار ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔“ ان کی نگرانی

کرنے والے پہلوان نے ہادی کی گردن پر ہاتھ رکھ کر کہا اور جھک کر اسے بیلچہ اٹھا کر دیا۔

”ایک تو ان سب کو باتیں بڑی بنانی آتی ہیں۔“ ہادی نے ایک گہرا سانس لیا۔

دیکھنے میں جو کام جتنا آسان نظر آتا ہے، کرنے میں وہ اتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ یہ چکنی مٹی، ان کی جان پر چکنے پہاڑ کی طرح وزنی ثابت ہو رہی تھی۔ نہ وہ اپنی جگہ سے کھسک رہی تھی، نہ یہ اسے کھسکا پا رہے تھے۔ تینوں بری طرح سے ہانپ رہے تھے۔ سامنے سارے پہلوان تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے.....

”حقیقی پہلوان تہجد سے پہلے اٹھتا ہے اور تہجد کی نماز پڑھتا ہے۔ حقیقی پہلوان کو اسی وقت اصل طاقت نصیب ہوتی ہے، جب وہ حقیقی طاقت وار کو پہچان لیتا ہے۔ جب وہ اپنا سارا تان اور پورا من خدا کے حضور جھکا دیتا ہے۔“ دعا کے بعد بھاء نے بلند آواز سے کہا۔

تہجد کا وقت..... رات کا سب سے محبوب پہر.....

اس پہر سے پہلوان کبھی غافل نہیں رہتا..... رہ جائے تو وہ پہلوان نہیں رہتا.....



تہجد کے بعد وہ اکھاڑے میں اتر آئے اور ڈنڈ بیٹھکیں، ڈنڈ پللیں ہونے لگیں۔ وہ کیسے بچے رہ سکتے تھے۔ ہادی کو یاد آیا کہ اسے مرض کھجلی عطیہ کرنے والا چھوٹا ڈنڈ بیٹھکوں سے بدک کر بھاگ گیا تھا۔ کوئی مذاق تھا ڈنڈ بیٹھکیں لگانا۔ بیس ڈنڈ بیٹھکوں کے بعد وہ بھی بدک گیا۔

”اور نہیں لگانی مجھے..... چھوڑ دیں بس مجھے..... میرا باپ بننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے.....“ وہ ضدی اکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

”باپ ایک ہی ہوتا ہے..... کوئی اور بننے کی کوشش کرے تو اس کا منہ توڑ دینا چاہیے۔“

ان سب کی نگرانی کرتے بھاء نے دبنگ کہا اور اشارہ کیا۔ دو پہلوان آگے بڑھے، دائیں بائیں شانوں سے پکڑا، ایک پشت پر کھڑا ہو گیا۔ تینوں مل ملا کر اس کی ڈنڈ بیٹھکیں لگوانے لگے.....

”ایک..... سو ایک..... آدھا ایک..... پونا ایک..... چاچا ایک..... ماما ایک..... لو ہو گیا پورا ایک.....“

حویلی کے جھروکوں سے نسوانی قہقہے سنائی دیے۔ یہ تو شرم سے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ وہ نجل ہو گیا۔

فجر کی نماز کے بعد وہ سب دوڑ لگانے، کسرت کرنے لگے۔ ابراہیم موقع شناس تھا۔ کچھ عقل طال کی بھی کام کر رہی تھی۔ دونوں کو اچھی طرح سے اندازہ ہو چکا تھا کہ ان کا حکم مانے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اتنی ساری فوج کی موجودگی میں وہ حویلی سے بھاگ بھی نہیں سکتے تھے۔ لیکن ہادی کی عقل نے ابھی ٹھیک سے کام کرنا شروع نہیں کیا تھا۔ وہ ڈنڈ پیل وغیرہ سے ہی تھک کر چور ہو چکا تھا۔ دوڑ کے لیے اکڑ کر کھڑا رہا.....

کھڑا رہا..... کھڑا رہا..... کہ ایک پہلوان آیا، اس کی دونوں ہتھیلیوں کو اکھٹا جوڑ کر کلاسیوں میں کلک کی آواز کے ساتھ ہتھکڑی جیسا بینڈ فٹ کیا۔ نا سمجھی سے اس نے پہلوان کو دیکھا ہی تھا کہ اس بینڈ کے ساتھ آ کر ایک زنجیر منسلک ہو گئی۔ زنجیر جس کا آخری سراپٹہ کی صورت کتے کے گلے میں فٹ تھا..... کتوں میں کتا، ”خونخوار کتا“.....

پہلو ان نے سیٹی ماری اور کتا..... کتا صرف کتا نہ رہا، ہوائی مخلوق بن گیا۔ یہ جاوہ جا..... پہلے جھٹکے میں ہادی منہ کے بل گرا۔ ناک منہ سے خون نکلا لیکن کتا نہیں رکا۔ ویسے بھی کتوں کا خون سے کیا لینا دینا۔ وہ کرین مشین کی طرح اسے اپنے ساتھ گھسیٹتا رہا..... گھسٹتا رہا تھا..... دوسرے چکر میں وہ گرتے پڑتے دوڑنے لگا۔ کتا اسے سانس لینے کا موقعہ ہی نہیں رے دہا تھا۔ اب یہ اس کی مرضی تھی کہ وہ زمین پر رگڑ کھا کر، گر کر، گھسیٹ کر بھاگنا چاہتا تھا یا کھڑا ہو کر دوڑ کر..... اس نے دوڑ کر ذلیل ہونا مناسب سمجھا۔ تیسرے چکر میں اس کا سینہ پھٹ جانے کے قریب ہو گیا۔ چوتھے چکر میں، ساری دنیا، چرند پرند، گھومتے گھومتے رک گئے، صرف وہ اکیلا گھومتا رہا..... پانچویں چکر میں اس کا اور کتے کا تیل میل بیٹھ گیا۔ اسے دوڑنے میں مزا آنے لگا۔ چرند پرند، زمین آسمان، سب اپنی اپنی جگہ پر واپس آ گئے۔ چھٹے چکر میں وہ اپنے گاؤں پہنچ گیا..... اپنے کھیتوں کے اطراف بھاگنے لگا..... ابا کی آواز سننے لگا.....

”شاوا میرے شیر! شاوا..... اک چکر ہو..... اک چکر ہو..... بس اک ہو.....“

ساتویں چکر میں اسے کھیتوں کی پگڈنڈیاں پر کودتیں پھاندتیں آپا، زینب اور سحر اپنی طرف آتی دکھائی دیں۔

”ہاں جی ڈو صاب! کیسی چل رہی ہے فوجی ٹریننگ۔ ہی ہی ہی! چلو چلو بھاگو شاہاش..... ایویں کہیں گر کر نہ جانا۔ گاؤں کی لڑکیاں چھپ کر تمہیں دیکھ رہی ہیں، ہماری ناک نہ کٹو ادینا.....“

گاؤں کی کون کون سی لڑکی اسے چھپ کر دیکھ رہی ہے، یہ دیکھنے کے لیے وہ رکا اور توازن بگڑنے پر گر گیا۔

”ہی ہی ہی! شو خاتے نکما شیر! تھوڑا لوفرتے لفنگاوی..... گاؤں کی لڑکیاں اتنی فارغ نہیں ہیں جو تمہیں دیکھنے کے لیے مری جائیں.....“

”ہائے ماں..... تیرا لال مر گیا ماں.....“

ماں کا لال زمین پر گر کر رہا نہ لگا تھا۔ کتوں میں کتا خونخوار کتاب اسے ہمدردی سے دیکھ رہا تھا۔

”ناشتہ تیار ہے جی..... آ جاؤ سب.....“ پہلو ان بچے نے پہلو انوں کو دیکھ کر اعلان کیا اور گرے ہوئے ہادی کو دیکھ کر ”پچ، پچ“۔

ناشتے کے لیے ہادی اور طلال کو بھاء بھولو نے خاص طور پر اپنے ساتھ بٹھایا تھا۔ ابراہیم ڈٹ کر کھا رہا تھا۔ وہ باکسر رہا تھا، اسے تو جنوں بھوتوں والی بھوک لگا کرتی تھی۔ پانچ انگلیوں کا مکا بنا کر سامنے والے کو ”مکا“ ہی دینا آسان نہیں ہوتا۔ ”بکرے، دبے، پایوں کا سالن تھا۔ لسی، دیسی گھی کے انڈے پر اٹھے۔ بھاء بوٹی بوٹی توڑ کر ان کی طرف بڑھا رہے تھے۔

”کھاؤ کھاؤ شاہاش! رزق حلال ہو، اور جسم میں خیر ہو..... شکریہ یا الہی.....“

پھر بھاء نے میخ والی ہڈی لی اور ہادی کا منہ ٹھوڑی سے پکڑ کر کھولا۔ ہڈی کے کنارے پر ہتھیلی سے ضرب مار کر میخ ہادی کے حلق میں اتار دی.....

”سوکھے ہوئے دماغ کو تر کرتی ہے یہ میخ۔ بات بات پر بہت بھڑکتے ہو تم۔ اب ٹھیک ہو جاؤ گے انشا اللہ۔ اسے میخ والی ہڈیاں دو نکال نکال کر۔“

بھاء کے کہنے کی دیر تھی، دسترخوان پر جتنے پہلوان بیٹھے تھے سب میخ والی ہڈی، بوٹی نکال نکال کر اس کی پلیٹ میں رکھنے لگے۔ بھاء ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر منہ کھولتے جاتے اور تھیلی کی ضرب سے میخ اس کے حلق میں اتارتے جاتے۔

”بس بس! میرا دماغ، دل گردے، پھیپھڑے، بال و پر سب تر ہو گئے ہیں۔“ ہادی نے انکار میں ہاتھ بھی ہلائے اور پورا جسم بھی۔

پر.....

”سیانے کہتے ہیں بڑے کھانے کے لیے زہر بھی دیں تو کھالینا چاہیے۔ ایسے ہاتھ پیر نہیں مارنے چاہیے۔“

ہاتھ پیر مارنے کی گنجائش ہی نہیں بچی تھی۔ اس پاس، آگے پیچھے، سب پہلوان غیر محسوس اسے دبا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ تو ایک انچ نہیں بل سکتا تھا۔ ہاں پر بے چارہ بڑی بے چارگی سے ابراہیم کو دیکھ رہا تھا کہ یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے۔ اس کی بے چارگی دیکھی ان دیکھی کر کے ابراہیم سر جھکا کر دبنے کے ساتھ انصاف کرنے لگا۔ کیونکہ سیانے یہ بھی کہتے ہیں کہ دوسروں کے معاملات میں ٹانگ نہیں اڑانی چاہیے ورنہ اپنی گردن پھنس جاتی ہے۔

☆ ☆ ☆

”وہ چاچا امام دین؟“ ان تینوں نے تقریباً اکڑ بکو کر کے طلال کو بھاء کے پاس جواب لینے کے لیے بھیجا تھا۔

”کہہ کر گیا تھا ایک دو دن میں آ جاؤں گا۔ ابھی تک آیا نہیں۔“

”پھر آپ ان کی امانت رکھ لیں اور ہمیں اجازت دیں.....“ طلال بھاء سے کافی فاصلہ رکھ کر کھڑا تھا..... احتیاط.....

”کیا پتا وہ سال، چھ مہینے تک دوبارہ یہاں کا چکر لگائے ہی نا..... امانت کا بہت بوجھ ہوتا ہے جی.....“

”تو پھر.....؟“ ایک تو طلال سے بھاء کے سامنے بولا ہی نہیں جاتا تھا۔

”تو پھر اس کی امانت اپنے پاس رکھو۔ میں ایک دو بندے بھیجتا ہوں، ایک دو ٹھکانے اور میں امام دین کے۔ شاید کوئی اتنا پتلا مل جائے۔“

طلال نے آ کر ان دونوں کو سب بتا دیا۔

”دو دن اور دیکھ لیں؟“ ابراہیم دونوں سے پوچھ رہا تھا۔

”لیکن میں اور ڈنڈ بیٹھکیں نہیں لگاؤں گا اور دوڑ بھی۔“ وہ بدک کر کھڑا ہوا اور کھڑکی میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ نیچے پہلوان بچے، ”تزک پہلوانی“ کی گنتی گن کر جہانگیری بچوں کی جان ہلکان کر رہا تھا۔ اس نے دانت پیس کر اسے گھور کر دیکھا تو بچے کی چھٹی ساتویں حس نے بیدار ہو کر اسے سراٹھا کر اوپر دیکھنے کی تلقین کی۔ اس نے سراٹھایا اور ہادی کو گھورتے پایا.....

”آ جائیں بھاء جی آپ بھی..... ڈنڈ بیٹھک کی تھوڑی اور پریکٹس کروادوں آپ کو جی.....“ وہ بڑے خلوص سے مسکرایا۔

”پہلے اپنی گنتی ٹھیک کر موٹو، پھر مجھے ”پریکٹس“ کروانا.....“ ہادی نے جل کر کہا۔

”بہت بھولے ہو جی آپ.....“ موٹو قہقہے لگانے لگا۔

”اور تو پورا بد معاش ہے۔“ ہادی معصوم سے پہلو ان بچے سے باقاعدہ لڑ رہا تھا۔ ابراہیم نے خائف ہو کر اسے دیکھا۔

”پھر اسی شہر میں کہیں اور رہ لیتے ہیں۔ یہاں سے چلے جاتے ہیں۔“

ابراہیم نے مسئلے کا آخری حل پیش کیا، جسے سب نے منظور کر لیا۔ وہ بھاء کو خدا حافظ کہنے کے لیے آگئے۔ ساتھ یہ بتانے لگے کہ وہ

چند دنوں بعد آکر چاچا امام دن کا اتنا پتا معلوم کر لیں گے۔ ابھی فی الحال وہ یہاں سے جا رہے ہیں۔

”میری مہمان نوازی میں کوئی کسر رہ گئی ہے کیا؟“ بھاء نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

”کسریں نکال دی ہیں آپ نے ان کی جناب!“ جس نے پہلے دن ہادی کو چھینر ماری تھی وہ کہہ کر کھی کھی ہنسنے لگا۔

”مہمان ایسے گھر چھوڑ کر جائے تو میزبان کی بڑی بے عزتی ہوتی ہے۔ سچی۔“ بھاء نے معصومیت پر بے چارگی بھی طاری کر لی۔

”دراصل یہ ڈنڈ بیٹھکیں، ڈنڈ پیل وغیرہ نہیں کرنا چاہتے۔ آپ زبردستی بھی تو بہت کرتے ہیں۔“ ابراہیم نے کہا تو نارمل انداز سے تھا

لیکن اس کے لہجے سے آگ پر تیل چھڑکنے کی بو آرہی تھی۔

”اب کوئی ڈنڈ بیٹھک وغیرہ نہیں ہوگی..... بس خوش؟؟؟“ بھاء نے وعدہ دینے والے انداز سے ہاتھ اٹھایا۔

پھر واقعی کوئی ڈنڈ بیٹھک نہیں ہوئی تھی۔ ہو جاتی تو اچھا تھا، کیونکہ اگلے دن انہیں گڑا گردن پر رکھ کر اکھاڑے کے چکر لگانے پڑے

تھے..... بس سب خوش؟؟؟

رستم زماں غلام محمد کا پہلو ان کا گڑا دوسن کا تھا۔ تا کہ ان کا حریف گردن پر بیٹھ جائے تو وہ اسے اٹھا کر پٹخ سکیں۔ سنا ہے زندگی میں موت کا بخار بھی گردن سے سر کو چڑھتا ہے۔ پیٹھ سے بائیں رخ گھس کر دل کی طرف نقب لگاتا ہے۔ دل و روح پر نقب کے لیے شیطان اسی رستے سے آتا ہے۔ اس بخار کو اتار پھینکنے کے لیے جسمانی طاقت کی نہیں، روحانی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔

ان کا گڑا دوسن کا نہیں تھا، جتنے بھی وزن کا تھا ان تینوں نے گردن پر اٹھا کر اکھاڑے کے چکر لگانے شروع کر دیئے تھے۔ بھاء ان کے چکر گن رہے تھے۔ سب کی اُردو کمزور تھی یا ان کے اسکلولوں کے ماسٹر ہی ڈھیلے رہے تھے۔ کسی کو بھی ٹھیک والی گنتی آتی ہی نہیں تھی۔

”یہ بڑی بے ایمانی ہے۔ ایک، دو، تین..... ایسے ٹھیک ٹھیک گنتی گنیں نا..... یہ پا، ادھ پا، پونا، وغیرہ سب کیا ہوتا ہے؟“ ہادی نے جھنجھلا کر گڑے کو زمین پر نکال دیا۔ اس کا سانس اس کے ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”بیٹا جی! یہ بھی گنتی ہی ہوتی ہے۔ ہمیں ہمارے اُستادوں نے یہی سیکھائی ہے۔ استاد کا علم افضل ہوتا ہے۔ چلو اب میں ادھ پا، پونا وغیرہ نہیں کرتا۔ ٹھیک ہے؟ درمیان میں بولنے کی سزا پر پانچ نمبر پیچھے۔ چلو شاباش ہن شروع ہو جاؤ۔“

”چھ شیر..... چھ شیر دالبا..... چھ شیر دی اماں..... چھ شیر دی مانی..... چھ شیر دی ماسی..... سو ہنا چھ..... لوہن ہو یا پورا چھ.....“

”لغت پہلوانی“ نے ان کے کڑا کے نکال دیے تھے۔ دس چکر تھے کہ پورے ہونے میں نہیں آ رہے تھے۔

”تمہیں درمیان میں بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ لو پھر گئے پیچھے..... چھ شیر دی کپتی پھوپھی.....“ طلال نے دانت پیسے۔

چھ شیر کی کپتی پھوپھی کے دانت نکل آئے.....



کوشش کے باوجود وہ حویلی سے باہر نہیں جاسکے تھے۔ وہ بھاء سے ڈرتے تھے پہلوانوں سے یا وہ خود ہی جانا نہیں چاہتے تھے..... وہ ابھی تک سمجھ نہیں سکے تھے۔ جب کبھی وہ چھپ کر بچا کر بھاگ نکلنے لگتے، ان کے ارادے کمزور پڑ جاتے۔ تھوڑی دور جا کر ہی واپس آ جاتے۔ سوچتے بھاء کا دل برا ہوگا۔ انہیں بھاء کو خدا حافظ کہہ کر نکالا چاہیے۔ انہیں یقین ہونے لگا تھا کہ وہ بھاء کے ٹرانس میں چلے گئے ہیں۔ جب تک وہ بھاء کے آس پاس رہتے تھے، ٹھیک رہتے تھے۔ جانے کا سوچتے تھے تو ان کے دل بیٹھنے لگتے تھے۔ ڈیپریشن ہونے لگتا تھا۔ انہیں بھاء کی زبردستیاں اچھی لگنے لگی تھیں.....

یہ زبردستیاں انہیں زہر لگنے لگی تھیں.....

یہ تو انہیں بھی نظر آ رہا تھا کہ حویلی کے اکھاڑے میں خاص مقابلوں کے لیے کبڈی اور کشتیوں کی تیاری کی جا رہی ہیں۔ لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اس دنگل میں انہیں بھی شریک کر لیا جائے گا۔ ایسے یا ایسے..... ورنہ کیسے بھی.....

جس میدان میں کبڈی اور کشتیوں کے لیے ڈھول پیٹے جا رہے تھے وہاں کم و بیش میلے کا سا سماں تھا۔ وہ غیر دلچسپی سے اس میدان میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ زمانہ نیا تھا لیکن زمانے کا بہروپ پرانے وقتوں میں بدل گیا تھا۔ تب شاید لوگ تاگوں، گھڑ گاڑیوں، ریڑھیوں، سائیکلوں پر آتے ہوں گے۔ اب کاروں، موٹر سائیکلوں، چھوٹی بڑی بسوں، موٹر سائیکلوں وغیرہ پر آئے تھے۔ تب میلوں میں دنگل ہوتے ہوں گے۔ اب دنگل ہی میلہ تھا۔

کالج یونیورسٹی کے لڑکے لڑکیوں کی بہت بڑی تعداد آئی تھی۔ اسکولوں، مدرسوں وغیرہ کے بچے بچیاں۔ پتا نہیں گوجرانولہ میں تفریح کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا یا انہیں یہی تفریح پسند تھی..... بھاء بھولو کے پہلوانوں کی کبڈیاں اور کشتیاں.....

میدان میں نمایاں جگہ پر بھاء بھولو کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ صبح سے وہ انہیں نظر نہیں آئے تھے۔ اب ان سے نظر ملی تو ہاتھ کے اشارے سے انہوں نے ہادی کو اپنے پاس بلایا۔ جیسے ہی وہ ان کے قریب گیا، سلام کیا، تو انہوں نے لپک کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے تھپک کر اگلے ہاتھ میں منتقل کر دیا..... پہلوان کے ہاتھ میں.....

”کھیل ہمارا ہادی شروع کرے گا.....“ بھاء نے بلند آواز سے کہا۔

”کھیل..... ہادی..... شروع.....“ وہ ان لفظوں کا مطلب سمجھتا اس سے پہلے پہلوان نے اسے گڑے کی طرح اٹھا کر سر سے بلند کر لیا۔ ڈھول اور لوگوں کا شور اس کے بعد اٹھا اور کان پڑی آواز سنائی دینا بند ہو گئی۔

کھیل باقاعدہ شروع ہو چکا تھا۔ اسے اٹھائے اٹھائے پہلوان نے میدان کا چکر لگایا۔ بچے تالیاں مارنے لگے۔ لڑکے سیٹیاں۔ دنگل شروع کرنے سے پہلے وہ بچوں، بڑوں کو محظوظ کرنا چاہتے تھے..... بس..... اتنی سی بات تھی.....

اتنی سی بات پر ہادی خواہ مخواہ ہاتھ پیر ہلا رہا تھا۔ چلا رہا تھا۔ جتنا وہاں شور تھا اس کی آواز کس نے سنی تھی۔ پھر پہلوان نے اسے مجمع میں اچھال دیا۔ کالج کے چار پانچ لڑکوں نے اسے اچھی طرح سے کیچ کر لیا تھا.....

”اس بے چارے کے ساتھ کچھ زیادہ ہی نہیں ہو جاتا ہر بار؟“ طلال نے ابراہیم کو کہنی ماری۔

”آہستہ بولو ورنہ..... دس مرغی دا انڈا..... دس مرغی دا دوسرا انڈا..... دس مرغی دا تیسرا انڈا..... شروع ہو جائے گا۔ ان انڈوں میں سے چوز نے نکل آئیں گے لیکن دس عدد کی گنتی پوری نہیں ہوگی۔“

ابراہیم نے بھرپور سنجیدگی سے کہا تھا۔ طلال بھی پوری ایمان داری سے ہنسا تھا۔ اس کی ہنسی زرا دُور بیٹھے بھاء نے دیکھی اور خود بھی ہنس دیئے۔ اور پھر طلال بلند ہواؤں کی سیر کرنے لگا..... اسے لڑکوں کی طرف اچھا لگیا تو وہ بہت خجل ہوا..... لیکن پھر مسکرا دیا۔

”بھاء کہہ رہے ہیں اک وری ہو.....“ ہادی گرتا پڑتا غصے میں میدان سے ہی باہر جا رہا تھا کہ ایک پہلوان بھاگتا ہوا آیا اور اسے کمر سے پکڑ لیا۔

”کس خوشی میں اک وری ہو..... چھوڑو مجھے.....“ ہادی نے غصے سے خود کو اس کی گرفت سے الگ کرنا چاہا لیکن پہلوان کو غصہ آتا نہیں اور پہلوان پر غصہ نکلتا نہیں۔

لوگ سیٹیاں مار رہے تھے لڑکے تڑپ رہے تھے کہ پہلوان انہیں اٹھا کر اچھالیں لیکن جس کی طرف بھاء اشارہ کر رہے تھے پہلوان اسے ہی اٹھا رہے تھے۔ مجمع میں سے چند لاغر، ضعیف بوڑھوں کو بھی اٹھایا گیا۔ پھر کچھ ایسے واپس اچھال دیا گیا کہ نابالوں کو چوٹ آئی، نا کیچ کرنے والوں کو ان کی کوئی ہڈیاں چھیں.....

دنگل شروع ہو چکا تھا۔ نیلی، پیلی کاغذ کی جھنڈیوں کی اوٹ سے تینوں بھاء کے جوش و خروش سے دکتے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ یہ میلہ یہ رونق یہ دنگل سب بھاء کی وجہ سے ہو رہا تھا..... انہیں اپنے پہلوانوں پر فخر تھا..... فخر تھا کہ ان کے پہلوان تین سو ساٹھ داؤ جانتے ہیں.....

تین سو ساٹھ داؤ.....

☆ ☆ ☆

”جس دن میرا دنگل تھا اس دن وہ میرے کان کے قریب آیا اور بس اتنا کہا۔“

”بھولو یہ دنگل تجھے ہارنا ہو گا ورنہ باؤ لا ہو جائے گا۔“

”ایسی دھمکیاں اور ایسی للکاریں میں نے بہت سنی تھیں۔ میرے استاد نے سیکھایا تھا کہ دنگل بس دنگل ہوتا ہے۔ جیت جاؤ تو بھول جاؤ، ہار جاؤ تو دوبارہ کمر کس لو..... بس..... مجھے یاد بھی نہیں تھا کہ میں کتنے دنگل جیت چکا ہوں۔ لوگ گنتی کرتے ہو تو کرتے ہو۔ جیت کو میں اکھاڑے کی مٹی میں دفنا کر نکلتا تھا۔ لیکن..... کریم بخش اپنی ہار کو گن گن کر سنبھال سنبھال کر رکھتا رہا تھا۔ میرے اس دنگل کی بہت دھوم تھی۔ بے وقوف لوگوں نے بڑی بڑی شرطیں لگا رکھی تھیں۔ دوسرے شہروں سے لوگ اس دنگل کو دیکھنے کے لیے آرہے تھے۔ لوگ باؤ لے سے ہو گئے تھے.....“

”پھر..... آپ وہ کشتی جیت گئے؟.....؟“

”یا نہیں..... لیکن باقی سب یاد ہے..... میری حویلی کی دیواروں پر لکھا تھا ”جیت مبارک ہو بھولو.....“

تینوں نے نا سمجھی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ”کیا لکھا تھا؟“

”جیت مبارک ہو بھولو“ یہ لکھا تھا۔ میرے بچوں کے خون سے۔ میری ماں، میرے باپ، میرے شہہ جوان بھائیوں، میری سہاگن

بہنوں کے خون سے..... ایک ایک دیوار پر لکھا تھا.....“

وارکار ابھی تھا اور جان لیوا بھی..... ہادی کے دل کو زوردار جھٹکا لگا.....

”س..... سب گھر والے؟“ ادھر سوال..... پورا احساس.....

”پورا خاندان۔ میرے بھائی، بھابھیاں، بہنیں، بہنوں، ان کی اولادیں۔ چاچے، مامے۔ خاندان بھر کو اکٹھا کر کے میرا باپ

مٹھائیاں کھلا رہا تھا۔ ماں شربت کے گلاس بھر بھر کر پلا رہی تھی۔ بہنوں کی نظریں چوکھٹ پر لگی تھیں۔ میرے تینوں بیٹے کلف لگے سفید

کرتوں میں بھاگے دوڑے پھرتے تھے۔ ماں نے چاء میں ہاتھوں پر مہندی لگائی تھی۔ اترتی پھرتی تھی۔ کہتی پھرتی تھی.....

”میرا پتر سارے شہر دامن اے۔ اللہ جوانیاں مانیں.....“

رات اندوہناک تھی..... سیاہ کٹاری.....

اس دن کی روشنی بڑی قیامت خیز تھی۔ سارا محلہ، پورا شہر حویلی میں اٹھ آیا تھا۔ بھولو بھاگ بھاگ کر ایک ایک کا منہ چومتا پھر رہا

تھا۔ تالاب کنارے، چوباروں، دلیزروں پر اکھاڑے کی مٹی میں، کمروں اور مسہریوں پر۔ لوگ اسے پکڑ پکڑ کر روک رہے تھے اور وہ سب

کو پیچھے دھکیلتا جاتا تھا۔ پھر اس نے اپنی سفید پگڑی اتاری اور ایک ایک دیوار سے ایک ایک پیارے کا خون صاف کرنے لگا۔ لوگوں نے

کہا بھولو باؤلا ہو گیا ہے۔ ماں کی میت کے سر ہانے غم سے گرا بھولو دوبارہ نہیں اٹھ سکا تھا۔ اس کا نچا ادھر مفلوج ہو چکا تھا۔

سب سوال ختم ہو گئے..... تینوں نے چپ سادھ لی.....

”رستم زماں گاماں پہلوان کو زہریلے سانپ نے کاٹ لیا تھا۔ گاما جی نے تکلیف سہہ کر، جھک کر سانپ کو پکڑ کر کچل دیا تھا۔ سانپ

کے دانت ان کی ٹانگ میں گھس گئے تھے۔ انہوں نے پہلوانی کو دھبہ نہیں لگنے دیا تھا۔ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو موقع پر ہی دم توڑ دیتا۔ اسی

لیے میرے باپ نے کہا تھا۔

”پتر! پہلوانی کو داغ نہ لگنے دینا۔ تمہاری اصل طاقت پر ایک امتحان آئے گا۔ ایک آزمائش..... سرخرو ہو کر دکھانا.....“

ہادی کا حلق آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا.....

”من من کے گڑے اٹھائے تھے پندرہ سولہ کلو کی بیٹوں کی میتیں نہیں اٹھائی گئیں۔ سالم دبے بکرے کھائے تھے“ کوڑی روٹی کے

دونوں لے نہیں کھائے گئے۔ سیروں دودھ پیا تھا، صبر کے دو گھونٹ پینے بہت اوکھے لگے۔ غم کا ڈنگل بہت کڑا تھا۔ آزمائش کے اس اکھاڑے

کی کشتی بہت مشکل تھی.....“ بھاء اپنی گیلی آنکھیں پونچھ رہے تھے۔

”میں عمر بھر کے لیے مفلوج ہو چکا تھا۔ واقعی میں باؤلا ہو رہا تھا۔ دیواروں سے ٹکریں مارتا تھا۔ پر پہلوانی میں تین سو ساٹھ داؤ سیکھے

تھے میں نے ایسے کیسے ہار مان لیتا۔ ایک دن ایک داؤ کھیلا..... اگلے دن ماں کا غم مجھے ہرانے آیا، میں نے بھی اگلا داؤ چل دیا۔ تیسرے دن بیٹے یہاں وہاں بھاگتے دوڑتے دکھائی دیے..... میں نے پھر داؤ چل دیا۔ بہنوں کے لاڈ بھائیوں کا مان..... میں داؤ پر داؤ چلتا رہا..... بس چلتا رہا..... میں رکنا نہیں..... میں نے ہار نہیں مانی.....

اس طرح میں نے ہر روز ایک داؤ کھیلنا شروع کر دیا۔ تین سو ساٹھ دن، میں نے رستم زماں بن کر کشتیاں کیں۔ غم سے دو بدو ونگل لڑا۔ سوگ اور روگ کا اکھاڑا تھا، اور ہر طرف مجھے چت کر دینے والے غموں کے پہلوان ہی پہلوان تھے۔

تین سو اکسٹھوے دن مجھے جیت نصیب ہوئی تھی۔ مجھے بس اپنی یہی جیت یاد ہے۔ اللہ نے میرے دل ہلکا کر دیا تھا۔ روح سے بوجھ اور روگ دونوں رخصت کر دیے تھے۔ مجھے صبر کے اتھاہ سمندروں کا مالک بنا دیا تھا۔ اس دن مجھے ماں یاد آئی.....

”بھولو! زرا ہنس کے تے دکھا.....“

پھر میں نے ہمیشہ ہنس کر ہی دکھایا اور حویلی کا پھاٹک کھول کر بیٹھ گیا۔ اکھاڑے کی مردہ مٹی کو زندہ کرنے لگا۔ جوان آنے لگے، پہلوان بننے لگے۔ بڑے بڑے میدان فتح ہونے لگے۔ حویلی میڈیلوں اور ٹرافیوں سے بھرنے لگی۔ پتا نہیں کون کون سے لوگ اور این جی او فنڈ دینے لگیں۔ مجھے کوئی حساب کتاب نہیں۔ بس جو چاہیے ہوتا ہے وہ مل جاتا ہے۔ اس حویلی سے باہر نکلو تو کہیں کوئی نشئی، ویلا، نکما، آوارہ، چوراچکا، نہیں ملے گا۔ لوگ گردن سے پکڑ پکڑ کر حویلی چھوڑ جاتے ہیں کہ ”بھاء! اسے بندے کا پتر بنا دو۔“

میں نے خدا کی رضا پر اپنا سوگ توڑ دیا، اللہ نے اپنی مخلوق مجھ سے جوڑ دی..... بھاں بھاں کرتی حویلی ہری بھری ہو گئی۔ اب میں کسی کا چچا ہوں، کسی کا ماما، کوئی دادا کہتا ہے کوئی مانے کی طرف لاڈ کرتا اور کرواتا ہے۔ بس بہت ہے اتنا۔ اور انسان کو کیا چاہیے.....“

”اور وہ..... جنہوں نے مارا تھا.....؟؟؟“ طلال نے بھاء کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر عقیدت سے پوچھا۔

”اللہ کی آنکھیں بند نہیں ہوتیں پتر! وہ سب دیکھتا ہے۔ ہر لمحہ دیکھتا ہے۔ انگلی اٹھانے والوں کو بھی اور گردنیں کاٹ دینے والوں کو بھی۔ میں نے جو پہلا داؤ کھیلا تھا وہ یہی تھا.....“

”کیا.....؟؟؟ ہادی پوچھ رہا تھا۔“

”میں نے اپنا مقدمہ اللہ کی عدالت میں جمع کروا دیا تھا۔ اس کے انصاف پر یقین کو کامل کر کے، اٹھے پیروں واپس زندگی کی طرف لوٹ آیا تھا۔ اب وہ جانیں اور اللہ۔ میرے دشمن زرا سی ہار کو اپنی گردن پر نہیں سہا رکھے تھے۔ میں نے اپنے خاندان کی میتیں اپنی کندھوں پر اٹھا کر دل پر صبر کا تعویذ سجایا تھا۔“

”آپ کا دوسرا داؤ کیا تھا.....؟؟؟“ اسے شدت سے طلب ہوئی کہ وہ سب جواب ایک ہی سوال میں جان لے.....

”صبر کا..... اور میرا آخری داؤ“ اللہ کی رضا میں راضی ہو جانے کا تھا۔“ اس آخری داؤ کو میرا ”پہلا“ داؤ ہونا چاہیے تھا۔



زندگی جیتنے کے لیے تین سو ساٹھ داؤ آنے چاہیے۔ ورنہ صرف ایک۔ ”انسان کو جینا آنا چاہیے، مرنے تو سب نے جانا ہی ہے۔“

غم کو ہرانے کے لیے صرف تین داؤ بہت ہیں۔ ”ایمان، صبر، رضا“
اور اللہ کی محبت جیت لینے کے لیے صرف ایک..... ”جو میرے رب نے چاہا میں اس پر راضی ہوں۔“



چاچا امام دین نہیں ملے تھے۔ انہیں ان کے اگلے ٹھکانے کا اتنا پتہ مل گیا تھا۔ جس وقت وہ اپنی کاریں بیٹھ کر گوجرانولہ کی حدود سے باہر نکل رہے تھے اس وقت انہیں ویسی ہی چپ لگی ہوئی تھی جیسے کھیڑہ کان سے نکلتے ہوئے لگی تھی۔ ابھی تو نہیں لیکن شاید کبھی وہ سمجھ جائیں کہ بھاء کے پاس وہ زندگی کے زیادہ قریب تھے یا موت سے بہت دور..... ان سے دل کا تعلق تھا یا روح کا.....
اب وہ ملتان کی طرف رواں دواں تھے..... صوفیوں اور دریشوں کے شہر.....
محلہ کماں گراں کے ہنرمندوں اور بہاؤ الدین زکریا کے شہر.....
”یار یہی گھر ہے نا.....؟؟“

سب سے آگے طلال ہی تھا اور وہ اپنے پیچھے کھڑے ابراہیم سے پوچھ رہا تھا۔ گھر کے لکڑی کے کواڑ کھلے ہوئے تھے۔ اندر باہر ہر طرف سے گھر پوری طرح سے سفید تھا۔ ہلکے نیلے رنگ کے بیل بوٹوں، پھولوں، کلیوں کے نقش و نگار سے سجا ہوا تھا۔ پہلی نظر میں گھر پر چھوٹی سی مسجد کا گمان ہوا تھا۔ دوسری نظر میں کسی مدر دے وغیرہ کا.....

”اس آدمی نے اسی گھر کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس کے آس پاس اور کوئی گھر بھی نہیں ہے۔“ تھوڑا شک ابراہیم کو بھی تھا۔

”اسلام علیکم جی!“ بڑے سارے دوپٹے میں چھوٹی سی بچی دروازے تک آئی۔ مسکرا کر کہا

”وعلیکم اسلام! ہمیں اماں نوری سے ملنا ہے۔ چاچا امام دین یہیں ہیں؟“ طلال نے بچی کے گال کو مسکرا کر چھوا۔

”چاچا جی کل رات آئے تھے۔ اماں جی بازار گئی ہیں۔ آپ اندر آ جائیں۔“

بچی نے بڑے مودب انداز میں ان کے لیے راستہ چھوڑ کر اندر آنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ اندر آ گئے تو وہ ان سے دو قدم آگے ہو کر چلنے لگی۔ ذرا دور درختوں کی چھاؤں میں صفیں بچھیں تھیں، جن پر بیٹھے بچے، بچیاں سفید پیالوں پر پھول بوئے بنا رہے تھے۔

بچی انہیں ایک کمرے میں لے آئی۔ طلال اور ہادی تخت پر ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ ابراہیم نے موڑھا گھسیٹ لیا۔ ان کی پشت کی طرف کھڑکیاں کھلی تھیں۔ درختوں کی کچھ شاخیں کھلی کھڑکیوں سے اندر آرہی تھیں۔ پھولوں کی خوشبو اور سبزے کی تازگی..... دو اور بچے اندر آ گئے اور ان کے سامنے کھڑے ہوئے ہو کر شیشوں سے سجے ہتھ پنکھ سے انہیں ہوا دینے لگے۔

”بجلی نہیں ہے.....“ بچی نے پنکھا چھلنے کی وجہ بتائی۔

تینوں زیر لب ہنس دیئے۔ ابراہیم نے ہاتھ بڑھا کر بچے کے ہاتھ سے پنکھا لینا چاہا تو اس نے دینے سے انکار کر دیا۔

”ابھی نہیں..... آپ کا پسینہ خشک ہو جائے پھر.....“

جن پیالوں پر بچے نقش نگاری کر رہے تھے ان جیسے پیالوں میں ان کے لیے ٹھنڈا میٹھا پانی آگیا۔ کچھ دیر بعد بچوں نے ان کیلئے چٹائی بچھا کر دسترخوان لگا دیا۔ پتلی دال سے پیالے بھرے ہوئے تھے اور وہ بھاگ بھاگ کر ان کے لیے گرم گرم تنوری روٹیاں لارہے تھے۔

”بس کرو دیار! پیٹ پھٹ جائے گا ہمارا.....“ ہادی نے ہاتھ کے اشارے سے بچوں کو روکا۔ وہ ایسے ہی گرم گرم روٹیاں لاتے رہتے تھے تو وہ شام تک کھاتے ہی رہتے۔

”باجی کہہ رہی ہیں نماز کا وقت ہو گیا ہے، آپ کو مسجد تک لے جائیں.....“ کھانے کے بعد ٹوپیاں پہنے بیس بائیس بچوں کا گروپ ان کے سر پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔ نمازوں سے تو وہ بہت دُور نکل آئے تھے لیکن اتنے سارے بچوں کے سامنے شرمندہ بھی نہیں ہونا چاہتے تھے۔ اٹھے اور ان کے ساتھ مسجد تک چلے گئے۔

مسجد سے واپسی پر کمرے کی سمت جاتے جاتے طلال انہماک سے نقش بناتی بچی کو دیکھ کر رُک گیا۔ قدم بڑھا کر وہ اس کی سمت آیا اور پھر اس کے پاس نیچے ہی بیٹھ گیا۔

”بہت خوب صورت..... تمہارے ننھے ہاتھوں میں کمال کافن ہے.....“

”آپ کو اچھا لگا؟ یہ میں آپ کے لیے ہی بنا رہی ہوں.....“ اس نے سر اٹھا کر مسکرا کر کہا۔

وہ ہنس دیا۔ ”میرے لیے..... لیکن تم تو مجھے جانتی بھی نہیں ہو.....“

”جب آپ مسجد جا رہے تھے تو باجی نے آپ کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا کہ مجھے آپ کے لیے پیالہ بنانا ہے.....“

وہ حیران ہوا۔ ”اچھا..... انہوں نے ایسا کیوں کہا.....؟“

”انہوں نے کہا آپ کے سر میں بہت درد رہتا ہے۔“

اس کے سر میں واقعی ہر وقت درد رہتا تھا۔ ”اور کیا کہا انہوں نے؟“

”کہا کہ مجھے ”یا ارحم الراحمین“ کا ورد کرتے ہوئے اس پر نقش بنانے ہیں۔ عصر کی نماز کے بعد۔“

اس کے پاس سوال کرنے کے لیے اور کچھ نہیں بچا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دکھا۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ نیلے آسمان کے نیچے پرندے گھومن گھیریاں بنانے میں مصروف ہو چکے تھے۔

”خیریت سے پہنچ گئے تھے یہاں۔ کوئی مشکل تو نہیں ہوئی؟؟“

وہ چونک کر پیچھے مڑا۔ شاید وہ اماں نوری تھیں۔ ضعیف و ناتواں لیکن خوش اُمید اور ہشاش بشاش۔ اسی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”جی..... آپ کو ہمارے آنے کی خبر تھی؟“ اس نے بڑھ کر ان کے ہاتھ سے سبزی کا تھیلہ لے لیا اور ذرا دور رکھے تخت پر رکھ دیا۔

وہ ہنس دیں۔ ”ہم پرانے زمانے کے لوگ، آج بھی کوؤں کو بہت اہمیت دیتے ہیں.....“

”یہ میں نے بنا لیا ہے..... دیکھیں کیا بنا ہے؟“ بچی نے اپنا پیالہ اماں نوری کے سامنے کیا۔

”ماشاء اللہ۔ تم نے تو کمال کر دیا ہے۔ جاؤ اسے صالحہ کے پاس لے جاؤ۔“ بچی کے سر پر ہاتھ پھیر کر وہ اسے ساتھ لے کر درخت کے نیچے موڑھوں پر آ کر بیٹھ گئیں۔

”ہم چاچا امام دین سے ملنے آئے ہیں..... کہاں ہیں وہ.....؟“

”صبح نکلے ہیں یہاں سے۔ کہہ رہے تھے رات تک آ جاؤں گا۔“

”ہم گوجر نوالہ سے انہیں ڈھونڈتے یہاں آئے ہیں۔“

”چلو اب یہاں مل لینا.....“

”یہ سب برتن آپ بناتی ہیں.....“ طلال نے لکڑی کے تحت پر ترتیب سے رکھے پیالوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

”میں کچھ نہیں کرتی۔ میری بیٹی ہے صالحہ وہی یہ سب کرتی ہے۔ بچے بھی اسی کے پاس آتے ہیں۔ یہ جو برتن سامنے رکھے ہیں یہ

تیار ہو چکے ہیں اب جن جن کے ہیں وہ آتے جائیں گے اور لیتے جائیں گے۔“

”اور یہ گھر.....؟“ گھر کے سکون کے تینوں پہلی ساعت میں ہی مداح ہو چکے تھے۔

”یہ گھر..... یہ بھی اسی کے ہاتھوں کا کمال ہے۔ جب کچھ اور نہیں کر سکی تو یہ کرنے لگی۔“ ان کی آواز میں ہلکی سی اداسی سمٹ آئی۔

”میں نے آج سے پہلے کبھی اتنا خوب صورت گھر نہیں دیکھا۔“ اس نے ایمان داری سے کہا۔

”مغرب کی نماز کا وقت ہونے والا ہے اماں! مہمانوں کو بھی متوجہ کر دیں.....“

درختوں کے پیچھے کہیں سے آواز آئی۔ اس نے اتنی خوب صورت آواز بھی کبھی کہیں نہیں سنی تھی۔ گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تو وہ جا

چکی تھی.....

وہ جا چکی تھی تو اس کی آواز کیوں اس کی سماعتوں میں ٹھہری رہ گئی تھی.....



اگلے دن صبح ابراہیم اماں نوری سے باتیں کرنے لگا اور ہادی بچوں کے ساتھ صف پر بیٹھ کر ایک سفید پیالے کو بر باد کرنے لگا۔ اس

سے پہلے اس نے رنگوں سے بچوں کے گالوں پر کچھ کارٹون وغیرہ بنا دیئے تھے۔ بچے اس سے بہت خوش تھے۔ چاچا امام دین رات کو گھر

نہیں آئے تھے۔ انہیں آج کا دن بھی ان کے انتظار میں گزرانا تھا۔

وہ ٹہلتے ٹہلتے چھت پر آ گیا۔ چھت کی منڈیروں پر بھی فنکار نے اپنی فنکاری دکھادی تھی۔ دُور کو نے میں وہ لکڑی کے تحت پر بیٹھی

کسی کام میں مصروف تھی۔ پہلے اس نے واپس نیچے چلے جانا چاہا۔ لیکن جب وہ چاہ کر بھی وہاں سے ہل نہیں سکا تو اس نے اس کی سمت ہی

قدم بڑھا دیئے.....

پتلے باریک برش کو ہلکے نیلے رنگ میں ڈبو کر وہ پیالے کے پینڈے میں آیتیں لکھ رہی تھی۔ جو لکھ رہی تھی انہیں زیر لب دہرا بھی رہی

تھی۔ وہ خاموش کھڑا دیکھتا رہا..... اسے گماں گزرا کہ اسے یہیں آنا تھا..... ہمیشہ سے.....

صالحہ نے اس کی موجودگی کو محسوس کر لیا تھا۔ اس نے سر کو زرا سا اس کے رخ پر موڑا۔ ایک جھلک دیکھ لینے پر وہ غیر ارادی طور پر دو قدم پیچھے ہٹا تو وہ مسکرا کر اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پیالہ اٹھایا اور اس کے سامنے کیا۔

”یہ لیں آپ کا آب خورہ بن گیا ہے۔“

وہ خاموش کھڑا رہا۔ ہاتھ بھی نہیں بڑھایا۔ ذرا دُور بہاؤ الدین زکریا کے مزار کے سفید گنبد سے کبوتر پھراڑے۔ ان کے پروں کا شورا سے صاف سنائی دیا۔

”پینے کی ہر چیز اس میں ڈال کر پیئیں۔ اللہ شفاء دیں گے۔“ پیالہ اسے تھما کر وہ پلٹ کر تخت پر بکھری چیزیں سمیٹنے لگی۔ پھر جب وہ نیچے جانے لگی تو جاتے جاتے رک کر اسے دیکھنے لگی۔

”ویسے آپ بھی ڈر گئے تھے کیا.....؟؟“

اس نے شرمندگی سے ناں میں سر ہلایا۔ ”آئی ایم سوری.....“

”اٹس اوکے۔ مجھے ویسے بھی عادت ہو چکی ہے۔ خوب صورتی کی انتہاء ہو یا بد صورتی کی انسان دیکھ کر چونک ہی جاتا ہے۔“

”یہ..... یہ کیا ہوا.....؟؟“ جھجکتے ہوئے اس نے اس کے چہرے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ مسکرا دی..... ”جھلس گیا..... تیزاب سے.....“



وہ کالج سے بابا کی دکان کی طرف آرہی تھی۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ اس سے اپنا دوپٹہ اور ہاتھ میں پکڑی فائل سنبھالنا محال ہو رہا تھا۔ دوپٹے کے کنارے بار بار اس کے جسم سے آزاد ہو کر ہوا کے ساتھ پھڑپھڑانے لگتے تھے۔ وہ عاجز آچکی تھی اور جی چاہتا تھا کہ ہوا کو سامنے کھڑا کر کے مرغا بننے کے لیے کہہ دے۔

مرغا بننے سے پہلے ہوانے ایک تیز جھونکا اس کی طرف اچھا لال اور دوپٹہ جہاز کے بادبان کی طرح کھل کر لہرانے لگا۔ ایک آخری سہرا اس کی گردن میں اٹکارا گیا تھا..... ششدر ہو کر اس نے سر پیچھے گھمایا تو اس کے دوپٹے نے پیچھے والے کاپور اچھرہ ڈھانپ دیا تھا اور وہ ہاتھ مار کر چہرے سے دوپٹہ ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا..... بادل چھٹتے ہیں تو چاند نکلتا ہے..... دوپٹہ ہٹا تو چاند اور چاندنی دونوں نکلے.....

وہ دم بخود رہ گئی اور پورا زور لگا کر دوپٹہ کھینچا اور اپنے گرد کس لیا۔ غصے سے اسے گھورا جیسے یہ سب اسی کا کیا دھرا ہو۔ جبکہ اس کا کوئی قصور بھی نہیں تھا۔ دوپٹہ اس کا..... ہوا اللہ کی..... حادثہ حادثاتی..... وہ تو بے چارا انسان تو بس ملتان کا بازار دیکھنے نکل کھڑا ہوا تھا۔

”میری دادی کہتی ہیں تیز ہوائیں چلیں تو چڑیلیں بال کھول کر ہم انسانوں کو تنگ کرنے کے لیے ٹولیاں بنا کر باہر نکلتی ہیں..... اور میں یہ بتا دوں کہ میری دادی جھوٹ ووٹ نہیں بولتیں۔“

پلو کھینچ کر اس نے دوبارہ سر پر رکھا تھا اور غصے سے چلتی ہوئی چند قدم آگے گئی ہی تھی کہ پیچھے سے اس کی آواز آئی۔ کالے بادل مل ملا کر پورا زور لگا کر گرے۔ اور اپنا کالا چھاتا پورا کھول کر سارے دن کو چھپا لیا۔ وہ ایسی تیز طرار تھی تو نہیں تھی لیکن پھر بھی نجانے کیوں پلٹ

کر اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

”اور میری نانی کہا کرتی ہیں کہ بادل گر جیس تو الوؤں کی شکل جیسے جن بھوت ہم معصوم انسانوں کا خون پینے کے لیے اکیلے دھکیلے اپنے ٹھکانوں سے نکل پڑتے ہیں..... اور میں یہ بتا دوں کہ میری نانی صرف سچ و سچ بولتی ہیں.....“

الو گردن کو جھٹکا دے کر ہنسا۔ اسی وقت بادل پھر سے گرے اور بجلی نے کڑک کر پورے آسمان پر جال بچھا کر اندھیرے کو روشن کر دیا۔ دونوں نے بیک وقت سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ دونوں نے بیک وقت سر جھکا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں ایک ہی وقت میں دم بخود ہوئے..... اور.....

”یا اللہ خیر!“ اس کا دل دہل گیا۔ بجلی سے سہم کر کہا۔

”یا اللہ خیر!“ اس کے دل پر بجلی گری اور اس نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ صالحہ نے ایک خفا خفا سی نظر اس پر ڈالی اور تیزی سے بارش کی بوندوں پر ہاتھ مارتی، بابا کی دکان کی طرف بڑھ گئی۔

بارش برسی جاتی تھی..... وہ سامنے بھاگی جاتی تھی..... کالے بادلوں کے سائے میں وہ پیچھے چپ کھڑا تھا.....

چپ محبت بڑی اثر انگیز ہوتی ہے.....

وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے کیسے اور کس طرح خبر ہو جایا کرتی تھی کہ وہ کہاں ہے۔ وہ جہاں جاتی، اسے پانی۔ پیچھے سے آتے، سامنے سے گزر جاتے، شانے سے ٹکرا کر ہوا ہو جاتے.....

صالح لوگوں کی محبت بڑی پر امن ہوتی ہے.....

اس نے کبھی نظر بھر کر اسے دیکھنے کی جرات نہیں کی تھی۔ اس کے بابا کی ڈاڑھی سفید تھی۔ ماں کی نظروں میں بڑی حیا تھی۔ لیکن دل انسان کا وقت ارمانوں کا ہو تو نیند سے پہلے انسان بڑی جراتیں کر لیتا ہے۔ چوڑیوں کی کھنک پر اپنی ہنسی کو کھنکاتے ہوئے، اپنے پیچھے اس کے سائے کو محسوس کرتے ہوئے، وہ سوئی، سسی، ہیر سب ہو گئی تھی.....

”دل بہت بے چین رہتا ہے جی! اس میں پانی پینے سے چین آجائے گا؟“ ایک آب خورہ اٹھا کر وہ بابا سے پوچھ رہا تھا۔

وہ اپنے دھیان سے بابا کی دکان میں آئی تھی۔ جب وہ پلٹا تو آب خورہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا جسے اس نے تیزی سے جھک کر پکڑ لیا۔ وہ وہیں بت سی بن کر کھڑی ہو گئی۔ بابا دُور کچھ برتنوں کے ساتھ مصروف تھے۔ جھکے جھکے اس نے سر کو تھوڑا سا اٹھا کر اسے دیکھا۔

”آپ ہمیشہ ایسے ہی یہاں وہاں بجلیاں گراتیں ہوئی چلتی ہیں؟ ویسے ہی کہہ دیں، مر جاؤ یوسف! میں مر جاؤں گا۔“ وہ شرارت سے کہہ رہا تھا۔

”مر جاؤ.....“ اس نے دانت پیس کر ایک اور بجلی گراتے ہوئے کہا۔

”پوری طرح سے مر مٹ گیا ہوں..... اس دل سے..... اس جان سے..... اور کوئی حکم؟“ اب وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

وہ خوفزدہ ہو گئی۔ تیزی سے قدم اٹھاتی دکان کے پیچھے کا چھوٹا دروازہ کھول کر گودام میں آ گئی۔ دروازے سے پشت لگا کر گہرے

سانس لینے لگی۔ پھر درز میں سے جھانک کر اسے دیکھنے لگی۔ گیارہ مہینوں بعد اس نے ایسی جرات سے اُسے دیکھنا چاہا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ اسے دیکھنے کا اس کے پاس بڑا حق ہے۔ وہ یہ حق حاصل کر چکی ہے۔ کچھ فیصلے چار لوگوں میں نہیں، چار لفظوں میں ہوتے ہیں۔ دو لمحوں، دو دلوں میں۔ کچھ نامحرم، صرف ایک دستک سے ہی محرم بن جاتے ہیں۔ دنیا کے قاعدے تو چلتے رہتے ہیں۔ محبت کرنے والے اپنا قاعدہ خود لکھتے پڑھتے ہیں۔

ایک صراحی اس کے ہاتھ میں تھی اور اسے دیکھتے ہوئے وہ زیر لب ہنس رہا تھا۔ بابا سے باتیں کر رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ لکڑی کے اس چھوٹے دروازے کے پاس آ کر رک گیا اور عین اس جھری سے آنکھ لگا دی جس کے پیچھے اس کی آنکھ لگی ہوئی تھی.....

ایک لمحہ لگا..... دل ایک دھڑکن دھڑکا.....

دو آنکھیں چار نہیں ہوئیں تھیں..... ”ایک“ ہو گئیں تھیں.....



سارے ظروف جو وہ اٹھا اٹھا کر دیکھتا رہا تھا، وہ انہیں کتنے ہی دنوں تک اپنی ہتھیلیوں سے سہلاتی رہی تھی۔ اس نے محبت بہت اہتمام سے کی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ دکھ اٹھائے گی، شاید جدائی بھی کاٹنی پڑے لیکن پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جیسا کہ سب محبت کرنے والے مانتے ہیں کہ ایک دن بہار ہوتا ہے، ایک خزاں پھر عید ہو ہی جاتی ہے..... تو اس کا بھی یہ ماننا تھا.....

اس نے ملتان کی کوئی ایسی سڑک نہیں چھوڑی تھی جہاں رک کر اس کی راہ نہ دیکھی ہو۔ وہ کبھی اسے روک کر ہاتھ پکڑ کر کھڑا نہیں ہوا تھا۔ اسے بات کرنے یا ملنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ وہ جو کہتی وہ سن لیتا تھا۔ جو وہ سوچتا وہ پڑھ لیتی تھی..... بس اتنا ہی کافی تھا۔

اٹک سے یوسف اپنی اماں کو ان کے گھر لے آیا تھا۔ وہ اس شہر کا ہی نہیں تھا، ایک بار دوستوں کے ساتھ آیا تھا، اور پھر.....

”مجھے ایک ہی شوق تھا کہ میرا بیٹا پڑھ لکھ کر ڈاکٹر، انجینئر بن جائے۔ تینوں بیٹیوں کو پڑھانے لکھانے کی بہت کوشش کی لیکن میرے سرال خاندان کا ماحول لڑکیوں کے پڑھنے لکھنے کے حق میں نہیں تھا۔ لیکن یوسف کے لیے میں ڈٹ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ شہر کی بڑی یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔ بہت ذہین ہے میرا یوسف..... معصوم بھی بہت ہے.....“

یوسف کی ماں جتنی دیر تک ان کے گھر رہیں، اس کے واری صدقے ہوتی رہی تھیں۔ بھولی بھالی سی خاتون تھیں۔ اماں، بابا کو رشتے پر تو کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن انہیں ایسے اونچے خاندان میں بیٹی دینے سے خوف آتا تھا۔ پھر غیر برادری۔ دونوں کو خاندان بھر کی ناراضی کا بھی ڈر تھا۔ اتنا تو وہ سمجھ گئے تھے کہ بیٹی کی پسند ہے۔ انکار کیا تو بیٹی روگ لگا کر بھی بیٹھ سکتی ہے۔ نئے زمانے کی چال سمجھتے تھے لیکن ایسے باغی بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ لوگوں کی باتوں سے بھی ڈرتے تھے۔ بات چھپی تو رہے گی نہیں کہ غیر برادری میں لڑکی کا رشتہ کیوں دیا۔ سہولت کے لیے اماں ابانے کچھ وقت مانگ لیا تھا.....

وقت جسے بدلتے وقت نہیں لگتا.....

وہ بابا کی دکان کی طرف جا رہی تھی۔ آج سکیئنڈ شفٹ میں اس کا بی اے کا پہلا پیپر تھا۔ اماں نے صبح کھیر پکائی تھی۔ اس نے سوچا

کہ بابا کو کھیر بھی دے آئے گی اور انہیں سینٹر تک ڈراپ کرنے کے لیے بھی کہہ دے گی۔

چند دن پہلے اس نے یوسف کے لیے ایک پیالہ نقش کیا تھا۔ اس پر اپنا اور اس کا نام بھی لکھا تھا۔ زمین اسے گلستان اور آسمان چراغ دکھائی دیتا تھا۔ اس کی لمبی سفید چادر کا پلو ہلکی ہوا میں لہرا رہا تھا۔ وہ خوش تھی۔ اسے تمنا ہوئی کہ کاش کہیں سے یوسف اسے دکھائی دے جائے۔ دو ہفتے پہلے وہ اسے آخری بار نظر آیا تھا۔ گول کپے کھا رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ موٹر سائیکل پر اپنے کسی دوست کو بٹھا کر بازار کے چکر لگاتا رہا تھا۔ وہ اتنی اتنی دور سے سفر کر کے ایک نظر اسے دیکھنے آتا تھا۔ تو وہ بھی ایک نظر اسے دیکھنا چاہتی تھی.....

ابھی وہ بابا کی دکان سے دس پندرہ دکانیں دور تھی کہ ایک موٹر سائیکل اس کے پاس آ کر رکی۔ انہوں نے اپنے چہرے چھپائے ہوئے تھے۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹی ہی تھی کہ اس کی لُخراش چیخ نے وقت کا دم گھوٹ دیا.....

سانسیں آگ تھیں..... چیخیں انگارہ.....

وہ بازار وہاں کھڑے لوگ اس کی چیخیں اس کی طرف بڑھتا ہجوم..... کہرام برپا ہوا..... قیامت آئی اور اس پر ٹھہر گئی۔

پورے پانچ دن وہ زندگی اور موت کی جنگ لڑتی رہی تھی۔ بیس دن بے ہوشی، نیم بے ہوشی میں اور تین مہینے ہاسپٹل میں رہی تھی۔ وہ مرمز زندہ بچ گئی تھی..... لیکن اس کا کوئی پیارا زندہ نہیں بچا تھا.....

حادثے سے اگلے دن صبح کے اخبار میں یہ خبر آ گئی تھی کہ رشتے سے انکار پر لڑکے نے لڑکی پر تیزاب پھینک دیا ہے۔ لڑکی کی زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی ہے۔ دوسرے دن بابا کا بیان آ گیا کہ وہ یوسف کو قتل کر دیں گے، جس نے ان کی بیٹی کی زندگی برباد کر دی ہے۔ بازار کے کچھ دکانداروں کے بیان آئے کہ انہوں نے یوسف نامی لڑکے کو دکان کے چکر لگاتے دیکھا تھا۔ محمد رفیق کو یہ سب پسند نہیں تھا۔ رشتہ بھیجا تو محمد رفیق نے صاف صاف انکار کر دیا۔ یوسف دھمکیاں دینے پر آ گیا تھا..... بات بہت بڑھ گئی تھی.....

پانچویں دن یوسف کے قتل کی خبر اخبار میں تصویر کے ساتھ آ گئی تھی۔ اسے اس کے ہوٹل میں قتل کر دیا گیا تھا۔ اسی دن شام کو پولیس محمد رفیق کو پکڑ کر لے گئی تھی.....

اب ہر روز ایک نئی افواہ ہوتی۔ ہر روز ایک نئی خبر چھپتی۔ مقدمہ چلنے لگا۔ چھ مہینے گزر گئے۔ ساتویں مہینے کے پہلے ہفتے وہ جیل میں ہی دم توڑ گئے۔

پولیس نے رپورٹ میں موت کی وجہ ”ہارٹ ایٹک“ لکھی تھی۔ جیل میں جو چند لوگ بابا کو جانتے تھے انہوں نے موت کی وجہ کسی زہریلی چیز کو بتایا تھا۔ ان کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ جیل سے باہر خاندان والوں، محلے والوں کا ماننا تھا کہ بیٹی کے کرتوتوں نے جان لے لی۔ اتنی بدنامی پر بھی موت کو گلے سے نہ لگاتا تو کیا کرتا.....

بازار میں کوئی دکاندار ایسا نہیں تھا جو محمد رفیق جیسے شریف، نمازی، پرہیزگار انسان کی ایسی شرمناک موت پر ہاتھ اٹھا کر کانوں کو توبہ تو بہ کرتے ہوئے ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ خاندان کا کوئی فرد ایسا نہیں تھا جو اس بدکردار لڑکی پر چھوٹو نہیں کرتا تھا۔ ملتان میں کوئی گھرا ایسا نہیں بچا تھا جو اس جیسی بیٹیوں کے پیدا ہوتے ہی مرجانے کی دعائیں نہیں کر رہا تھا.....

گھر گھر اس کا نام تھا..... گھر گھر وہ بدنام تھی.....

”وہ چوری چھپے عشق معشوقی کرتی رہی تھی۔ ماں باپ نے رشتے سے انکار کر دیا تو بھڑک کر لڑکے نے تیزاب پھینک دیا۔ غیرت مند باپ نے لڑکے کو قتل کر کے خود کو بھی ختم کر لیا۔“ یہ کہانی باقی رہ گئی تھی باقی سب ختم ہو چکا تھا۔ دنیا کو کڑوے سچ سے نہیں چٹخا رہے دار جھوٹ سے مطلب ہوتا ہے..... بس.....

یوسف تین بہنوں کو اکلوتا بھائی، ماں باپ کی بڑھاپے کی اولاد تھا۔ اس کی بہنوں کے بچے اس سے عمر میں دو تین سال بڑے تھے۔ سالوں سے اس کے تایا، چچا تو یہ حساب کتاب لگا کر بیٹھے ہوئے تھے کہ اب جائیداد تینوں بیٹیوں کے حصے میں ہی آئے گی، اسی لیے انہوں نے بیٹیوں کے رشتے لیے تھے۔ لیکن یوسف نے حساب کتاب میں گڑبڑ کر دی تھی۔ لمبے وقت کی چال کو عین وقت پر الٹ دیا تھا.....

سارا شریکا اس ملی بھگت میں شریک تھا۔ تایا، چچا اور تینوں بہنوں کو خبر بھی نہیں ہوئی اور سب نے مل کر وقت پر چال چل دی۔ سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی سلامت رہی.....



اس کے علاج کے لیے اماں نے دکان کو بیچ دیا تھا۔ خاندان میں کوئی بھی اس کے علاج کے لیے ایک پھوٹی کوڑی دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ لوگ تو اس پر لعنتیں بھیج رہے تھے..... اس کے علاج کے لیے دوا کا انتظام کیوں کرتے؟ وہ تکلیف کی شدت سے ایسے چیختی، چلاتی اور کراہتی تھی کہ محلے والے اس سے عاجز آ چکے تھے۔ وہ گھر کی دہلیز پر کھڑے ہو کر او بیلا کرتے، ”انہیں شرم دلاتے کہ خدا کے لیے یہ گھر، یہ محلہ چھوڑ دو..... جان چھوڑ بھی دو ہم سب کی.....“ وہ اپنی جان بھی چھوڑ دیتی لیکن اس کا کسی شے پر کوئی اختیار ہی نہیں تھا۔ دکان تو سیل ہو گئی تھی لیکن گھر نہیں ہو رہا تھا۔ اماں بے چاری خاندان والوں، محلے والوں کے سامنے ہاتھ جوڑ جوڑ کر روتی تھی.....

”اور کچھ نہیں تو ترس ہی کھا لو میری صالحہ پر۔ کیسے تکلیف سے مچھلی کی طرح تر پتی ہے وہ.....“

”تو اپنے کرتوں کی سزا بھگت رہی ہے..... تو بہ کرے..... تو بہ.....“

”تو بہ کر کے اس جگہ سے ہجرت کر لینی چاہیے، جس جگہ لوگوں کے دل پتھر اور عمل سیاہ ہو جا چکے ہو۔“

چاچا امام دین نے آکر اماں سے بس اتنا کہا تھا اور ان کا تھوڑا بہت سامان سمیٹ کر انہیں اس گھر میں لے آئے تھے۔ گھر اجاڑ اور ٹوٹا پھوٹا سا تھا۔ لیکن اس کے آگے پیچھے احاطے بہت بڑے بڑے تھے کہ اس کی چیخیں اور کراہیں گھر سے باہر نہیں جاتی تھیں۔

زندگی کی نبض پر بس ایک ہی احساس غالب تھا..... درد..... درد..... درد.....

اس درد کے ساتھ اسے بہت سے غم مل گئے تھے۔ ایک محبت کے ساتھ اسے سو لعنتیں ملی تھیں۔ باپ کی موت کے ساتھ تسلی دلا سوں کی بجائے بدکرداری کی تہمتیں ملی تھیں۔ وہ لوگوں کے لیے دو کوڑی کی ہو چکی تھی۔ اس کے باپ کی کمائی ساری عمر کی عزت، خاک ہو چکی

تھی۔

خوب صورت آنکھوں والی کی ایک آنکھ کی بینائی ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی تھی، دوسری کی دھندلا چکی تھی۔ تیز رنگ اس آنکھ کو تکلیف دیتے تھے۔ وہ تقریباً کمر بلا سنڈ ہو چکی تھی۔ وہی رنگ اسے سکون دیتے تھے..... ”سفید اور نیلا“
آسمانی رنگ..... آفاقی رنگ.....



صبح پچھلے صحن میں صالحہ مرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھی، اور وہ تینوں اسے کھڑکی سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے زندگی میں اتنا پرسکون چہرہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے اس گھر جتنا خوبصورت گھر بھی کہیں نہیں دیکھا تھا۔ زندگی کا کچھ حصہ اگر جہنم ہے، تو اس کی پوری زندگی جہنم تھی..... پھر بھی وہ زندہ تھی..... نہ گئے میں پھندہ ڈالنا، نہ بلندی سے کود جانا چاہا..... لوگ اسے کالے منہ والی کہنے لگے تھے۔ اس کے پاس مرنے کے ہزار بہانے تھے۔ پھر وہ زندہ کیوں رہی؟

”اس واقعہ کے بعد..... کتنی تکلیف رہی تھی.....“ طلال کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کن الفاظ میں سوال کرے۔

وہ ہنس دی..... ”کبھی اہلے ہوئے تیل میں انگلی ڈبوئی ہے؟؟“

طلال کا سانس سینے میں اٹک گیا۔ ”علاج کے باوجود تکلیف رہی؟“

”علاج؟؟؟“ وہ پھر سے ہنس دی۔ ”جب آگ بھڑکتی ہے تو اسے ٹھنڈا ہونے میں بہت وقت لگتا ہے۔ آگ بجھ بھی جائے تو

کوئلے سلگتے رہتے ہیں..... سلگتے رہتے ہیں.....“

”تم بہت باہمت ہوڑ کی ہو..... م..... مم..... میں تمہارے لیے کچھ کر سکتا ہوں؟“

”ایک بار مسکرا دیں..... اتنا کر سکتے ہیں؟“

اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ مسکرا نہیں سکا لیکن ابدیدہ ہو چکا تھا.....

”میں بہادر نہیں تھی طلال صاحب! میرے رونے چیننے چلانے سے اماں کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔ ابا بھی میری وجہ سے چلے

گئے۔ اب اماں کو اپنی وجہ سے کچھ ہونے نہیں دینا چاہتی تھی تو میں نے ہر روز ایک چیخ، ایک تکلیف دبانے کا فیصلہ کر لیا۔ گھر کی دیواروں پر

نقش بنانے شروع کر دیے تھے۔ لیکن زیادہ فرق نہیں پڑ رہا تھا..... چند دن کوشش کرتی رہی..... پھر دل میں خیال وارد ہوا کہ،

”اس کی یاد میں ڈوب کر خود کو بھول جاؤ، جو بھٹکے ہوؤں کو بھی نہیں بھولتا.....“

”تو مجھے خود کو بھلا کر، مٹا کر اس کی یاد میں منہک ہونا تھا۔ اب میں ہر روز ایک آیت یاد کرتی، اسے دہراتی رہتی، دہراتی رہتی کہ میں

بھول جاتی کہ میں کون ہوں، کہاں ہوں۔ میں نے پیالوں کے پیندوں پر ان آیتوں کو لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ایک..... دو..... تین مہینے گزر

گئے..... یاد کرتی جاتی، لکھتی جاتی۔ دن بدل گئے..... وقت بدل گیا..... وہ تو سماں ہی اور ہو گیا پھر.....

”تکلیف بھول گئیں؟؟؟“

”اپنا آپ بھول گئی۔ دردِ جسم میں موجود ہو تو ہو، لیکن اس کی موجودگی کا احساس مٹ گیا تھا۔“

”اور لوگ..... معاف کر دیا انہوں نے.....“

”لوگ کہاں معاف کرتے ہیں جی! انسان تو پتھر ہے، اللہ اس پتھر میں رحم ڈالتا ہے۔ پتا نہیں کیسے ایک بچی گھر آئی، وہ یہاں وہاں کھیلاتی کودتی رہتی تھی۔ ادھر ادھر پیالے رکھے تھے، ان میں کھاتی پیتی رہتی تھی۔ اسے مرگی کا مرض تھا۔ پھر پتا نہیں چلا کیا ہوا، کیسے ہوا، ادھر ادھر سے لوگوں نے آنا جانا شروع کر دیا۔ کوئی بچہ لے آتا، کوئی بچی..... ایک دن ایک دکان دار آیا، بیس بائیس پیالے اٹھا کر لے گیا۔ آہستہ آہستہ دوسرے دکان دار بھی آنے لگے۔ ان کی مانگ بڑھ گئی۔ کوئی انہیں آسمانی پیالے کہتا ہے کوئی رحمانی۔

انسان کے بس میں کہاں ہے کہ وہ اللہ کے نظام اور اختیار کو سمجھ سکے۔ جس چہرے کی طرف دیکھ کر لوگ تھوکتے تھے اس کے پاس آ کر اپنی تکلیفیں بتانے لگے۔ میرا نام صالحہ سے صالحہ نور ہو گیا اور اماں کا میرے نام کی نسبت سے اماں نوری..... مجھے تو پہلے بھی نہیں پتا چلا تھا کہ میں لوگوں کو بری کیوں لگنے لگی ہوں۔ مجھے اب بھی پتا نہیں چلا کہ لوگ مجھے پسند کیوں کرتے ہیں۔

”تو ان پیالوں میں شفاء ہے.....؟“

”کبھی دوا میں شفاء ہوتی ہے طلال صاحب؟ بے جان چیزوں میں شفاء کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ تو اختیار والے کے کمال کا کمال ہے بس۔ اس نے چاہا کہ نیلی روشنائی ”شفاء“ ہو جائے اور وہ ہو گئی۔ انسان پر یہ احسان کیا جاتا ہے کہ اس کے ہاتھوں کمال کروا دیا جاتا ہے۔ ہم متکبر ہیں، اور بے وقوف بھی۔ اللہ کے احسانوں کو اپنا کمال کہتے..... اسی لیے اللہ کا ارشاد ہے،

”اور انسان بہت احسان ناشناس ہے۔“ (القران)۔

طلال دنگ اس کے پرسکون چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ ”تمہاری سمجھ بوجھ مجھے شرمندہ کر رہی ہے.....“

”میری عظمت کے گن نہ گائیں۔ شروع شروع میں میں بہت روتی تھی۔ پاگل ہو گئی تھی۔ اپنے حسن کے گہن پر بہت ماتم کیا تھا میں نے۔ بہت روتی تھی میں۔ پھر ایک خیال الہام ہوا کہ ”جس کا ایمان سلامت ہے، اس کا سب سلامت ہے۔ حسن کو باہر کہاں ڈھونڈ رہی ہو؟ ذرا اندر جھانکو۔“ میں نے اندر جھانکا تو مجھے میرا حسن مل گیا..... ”میرا ایمان..... میرا رب.....“ میرا آپ کا، ہم سب کا یہی تو حسن ہے۔ ہم کہاں کھال بال میں الجھے ہیں۔ ایک این جی او مجھے سرجری کے لیے باہر بھجوا رہی تھی، پر میں نے اپنی جگہ دوسری لڑکی کو بھیج دیا۔ دیکھیں نا میں دیکھ سکتی ہوں، سن اور بول سکتی ہوں، اور انسان کو کیا چاہیے۔ کھال کو چمکا کر کیا کروں گی..... ظاہری حسن کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے بھلا؟

”تم نے اپنے دشمنوں کو معاف کر دیا؟“

”وہ میرے دشمن نہیں ہیں، خود اپنے دشمن ہیں۔ جب انسان کسی کے ساتھ برا کرتا ہے تو وہ دراصل اپنے ساتھ برا کرتا ہے۔ بھلا جو

انسان اپنے لیے آگ اکٹھی کر رہا ہو، وہ کسی کے ساتھ کیا برا کرے گا.....؟؟“

”اور محبت.....؟؟“ اسے شدت سے اس سوال کے جواب کی ضرورت تھی۔

”جب یہ جان لیا کہ حقیقی محبت کیا ہے تو پھر مجازی محبت کا سوگ ختم کر دیا۔ یہ سب ایسے ہی ہونا تھا، ہو گیا۔ باہر سے آنکھیں بند کیں تو اللہ نے اندر چراغاں کر دیا۔ سب سوال منادینے، تو جواب خود بخود نکھر کر سامنے آ گئے.....“

”جواب.....؟؟“

”ہاں جواب کہ..... تکلیف کے راستے روشنی ملتی ہے..... اور روشنی کے راستے ”نور“.....“



فرنٹ سیٹ پر بیٹھے طال نے کھلی کھڑکی میں رکھے بازو پر اپنا سر رکھا اور باہر کے نظارے دیکھنے لگا۔ وہ یونیورسٹی کے پہلے دن، پہلی کلاس، پہلی نظر میں اریبہ کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ وہ بے حد حسین تھی اور ڈیپارٹمنٹ میں غیر معمولی طور پر مقبول بھی۔ وہ گھر تک اس کا پیچھا کرتا تھا..... اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے وہ سنڈے کو بھی اپنے گلابرگ کے بنگلے سے، روای پارکر کے اس گندے سندے علاقے میں جایا کرتا تھا۔ اس کے فرینڈز کہتے تھے کہ وہ ایک معمولی سی لڑکی کے لیے خود کو خوار کر رہا ہے۔

”میرے لیے اس کے سوا یہ ساری دنیا معمولی ہے..... بے کار اور بے وجہ.....“ وہ ہنس کر کہتا

”مجھ سے دور رہنا۔ لفٹ لینے اور لائن مارنے کا یہ گھسا پٹا انداز مجھ پر اپلائی نہ کرنا۔ نہ میں لائن میں آؤں گی نہ کسی سچی جھوٹی محبت کے چکر میں..... سمجھے.....“

وہ نا سمجھی سے اسے دیکھ رہا تھا جو اتنی سختی سے اس سے بات کر رہی تھی۔ ڈیپارٹمنٹ میں مشہور تھا کہ وہ کسی سے محبت کرتی ہے اسی لیے کسی دوسرے لڑکے کو گھاس نہیں ڈالتی۔ اس کا کوئی بچپن کا منگیترا ہے، جس کے لیے وہ ساری دنیا کے لڑکوں کو جوتی کی نوک پر رکھتی ہے۔ اس نے اپنی جوتی بدل لی تھی یا خیال، لیکن تیسرے سمسٹر میں وہ خود ہی اس کی طرف کھینچی چلی آئی تھی۔ شاید اسے اس کی محبت پر یقین ہونے لگا تھا۔ وہ اس سے لفٹ لینے لگی تھی۔ لنچ ڈز اور شاپنگ۔ پھر وہ اس کے گھر والوں سے ملا اور اپنے گھر والوں کو اس کے گھر بھیج دیا۔

ان کی منگنی ہوئی۔ نکاح اور پھر شادی ہو گئی۔ ڈیڑھ سال تک وہ ”سچی محبت“ کے حصار کا قیدی بنا رہا تھا۔ اس سچی محبت کے لیے اس نے ہر قیمت ادا کی تھی۔ ماما کو اریبہ پسند نہیں تھیں، اور اریبہ کو ماما۔ اس نے اسے الگ گھر لے دیا تھا۔ اس کے کہنے پر پاپا سے اپنا بزنس الگ کر لیا تھا۔ سارے بینک اکاؤنٹ اریبہ کے ساتھ جو انٹ کر لیے تھے۔ وہ اس پر اپنا دل ہارا تھا، بدلے میں ہر قیمتی چیز سے اسے جیت لینا چاہتا تھا.....

اگر انسان دانائی لے کر دنیا میں چلے پھرے، اور سچی محبت کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے تو اس پوری دنیا میں شاید ہی چار پانچ لوگ سچی محبت کے امین ملیں۔ آدھی دنیا دھوکے میں، زیادہ جھوٹ میں، اور باقی ماندہ غلط فہمی کی محبت میں مبتلا ملے گی۔ ماں کی محبت کے علاوہ انسان شاید ہی کبھی ”سچی محبت“ کا مزہ چکھ سکے.....

اس رات کے دن وہ میٹنگ کے لیے دیئی گیا تھا۔ لیکن جیسے ہی اس نے لینڈ کیا، اسے مطلع کیا گیا کہ میٹنگ کے لیے آنے والے

ڈیلیکیشن کے ہیڈ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ آئی سی یو میں ہے۔

میننگ کینسل ہو چکی تھی۔ اس نے اریبہ کے لیے شاپنگ کی اور رات کی فلائٹ سے واپس آ گیا۔

’بی بی گھر نہیں ہیں؟‘ وہ ٹیکسی سے آیا تھا۔ انٹرنس ڈوراک تھا۔ اس نے گردن موڑ کر گاڑی کی طرف دیکھا۔

گاڑی نے نظریں چرائیں۔ ”گھر ہی ہیں جی وہ.....“

”تو یہ لاکڈ کیوں ہے..... کوئی ملازم نہیں ہے اندر؟“

”سب ملازموں کو چھٹی دے دی تھی جی..... بس وہ ایک رقیہ.....“

وہ حیرت سے گاڑی کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ رہا تھا۔ پورچ میں ایک کار کھڑی تھی۔ یہ کار اریبہ نے اپنے بھائی کو گفٹ کی

تھی۔ وہ انٹرنس ڈور پر ہاتھ سے دستک دینے لگا تو جرات کر کے گاڑی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے حیرت سے گاڑی کی طرف دیکھا۔

جس وقت وہ بیڈروم کی پچھلی کھڑکی سے اندر گیا، اسے اس وقت بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے، کیوں کر رہا ہے۔ وہ پاگل یا

بے وقوف نہیں تھا۔ اسے اریبہ پر ایمان کی حد تک یقین ہے۔ ساری دنیا اکٹھی ہو کر آ جاتی تو بھی وہ.....

ساری دنیا خاک ہو چکی تھی..... دل کی دنیا دھول مٹی.....



وہ جانتا تھا کہ پیسہ اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ کہیں نہ کہیں اریبہ اس کے اسٹیٹس سے متاثر

تھی۔ اس نے تو اریبہ سے محبت کی شادی کی تھی، لیکن اریبہ نے اور بھی بہت کچھ دیکھ کر شادی کی تھی۔ وہ اتنا سب کچھ جانتا تھا.....

لیکن یہ اس نے بعد میں جانا تھا کہ اس کی اتنی بے تحاشا محبت پر بھی اس کی بیوی تحفے میں اسے دھوکا دے رہی تھی۔ جب وہ اس

کے گلے میں بانہیں ڈالتی ہے یا اپنی محبت کا اظہار کرتی ہے تو وہ اچھی اداکاری کرتی ہے۔ اس نے سچی محبت نہیں پائی تھی، اس نے اچھی

ادا کارہ پائی تھی..... بس.....

محبت تو وہ اس سے کرتی تھی، جس کے لیے وہ اپنے شوہر کے بینک اکاؤنٹ خالی کرتی جا رہی تھی۔ جسے وہ کار اور فلیٹ گفٹ کر چکی

تھی۔ جس کے ساتھ وہ شاپنگ پر جاتی تھی۔ جس کے ساتھ وہ ایک بار سنگاپور بھی جا چکی تھی۔

”تمہیں دولت چاہیے تھی تو مانگ لیتیں.....“ وہ صوفے پر سر جھکا کر بیٹھا اپنے جسم کی کپکپاہٹ کو قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”تم دے دیتے؟؟“ وہ بے شرمی سے گردن تان کر پوچھ رہی تھی۔

”ہاں دے دیتا..... تم پیسہ مانگ لیتیں لیکن مانگے بغیر مجھے یہ دھوکا نہ دیتیں.....“

”ہونہہ! تو اب دے دو..... اپنا سب کچھ دے دو اور طلاق بھی.....“ وہ ابھی بھی اس کی محبت کا ثبوت مانگ رہی تھی۔

میری محبت میں ایسی کیا کمی ہے.....؟؟ م..... مم.....“ اس کا اپنی سمت اٹھا ہاتھ بڑا کمزور اور ناتواں ہو گیا۔

”تم ہو کون؟؟ تم تو اس کے پیروں کی خاک بھی نہیں ہو۔“ محبت ہی اتنا بے خوف بناتی ہے۔ وہ بے خوفی سے پوچھ رہی تھی۔

وہ دنگ اپنی بیوی کی شکل دیکھ رہا تھا..... پھر اس نے ایک قہقہہ لگایا اور دیر تک ہنستا رہا اور پھر ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔
 محبت..... اس نے تو اس پر اپنا سب کچھ وارد کیا تھا.....
 محبت..... اس نے بھی پلٹ کر ”کاراوار“ کیا تھا.....



اسے نروس بریک ڈاون ہوا تھا۔ وہ ابھی ہاسپٹل میں ہی تھا کہ اریبہ اپنی محبت کے ساتھ ملک سے ہی باہر چلی گئی تھی۔ بینک اکاؤنٹ اس نے خالی کر دیے تھے۔ گھر اور بزنس کے شیئرز سیل کر دیے تھے۔
 اس کے زخم بھر رہے تھے۔ وہ نارمل لائف کی طرف آرہا تھا۔ صبح اٹھتا، جو گنگ کرتا، جم جاتا، پھر پاپا کے ساتھ آفس۔ رات کا ڈنر وہ سب مل کر کرتے۔ کافی کے ساتھ کچھ دیر بزنس کے معاملات ڈسکس ہوتے..... پھر نیند کی گولیاں کھا کر وہ سو جاتا.....
 آہستہ آہستہ نیند کی گولیوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ پھر سرے سے نیند ہی غائب ہو گئی۔ وہ سکاٹر سٹ پر سکاٹر سٹ بدلنے لگا۔ ڈیپریشن بھی اپنے لیول بدلنے لگا۔ وہ پہلی سے دوسری اسٹیج کی طرف جانے لگا۔ بظاہر وہ نارمل نظر آتا تھا لیکن حقیقت میں پوری طرح سے ابنا رہا تھا.....

”تم ہو کون.....؟؟“ وہ جب بھی خود کو مر رہیں دیکھتا اسے یاد آتا۔

”میں کون ہوں؟“ وہ خود سے پوچھتا..... گھنٹوں مر رہے سامنے کھڑا رہتا۔ دنیا کے بد صورت ترین انسان کو دیکھتا رہتا۔
 ”تم تو اس کے پیروں کی خاک بھی نہیں ہو۔“

اس نے گھر کے سارے آئینے توڑ دیئے۔ وہ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا۔ چیخنے چلانے لگا۔ دیواروں سے سر ٹکرانے لگا۔ خود کو زخمی کر لیا۔ گھر کے نو ملازموں کے لیے اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔

پھر ایک دن وہ پنکھے سے لگتا ہوا ملا۔ ملازم نے بروقت آکر اسے پیروں سے اٹھا کر اوپر کر لیا تھا۔ اور پھر وہ مینٹل ہاسپٹل آ گیا۔
 دنیا کا سب سے زہریلا زخم ”بے وفائی“ کا زخم ہوتا ہے۔ دنیا کی سب سے گہری چوٹ ”محبت کی چوٹ“ ہوتی ہے۔



”یہ چاچا امام دین ہیں یا چاچا تارڑ دین؟ یہ ایک جگہ ٹک کر کیوں نہیں بیٹھتے بھئی! جہاں جاؤ، وہاں سے آگے نکل چکے ہوتے ہیں۔“ ڈرائیونگ ہادی کر رہا تھا۔ جھنجھلا بھی وہی رہا تھا۔

لگتا ہے یہ چاہتے ہیں کہ ہم مرنے سے پہلے سارا پاکستان گھوم پھر لیں.....“ ابراہیم نے ہنس کر کہا۔
 ”مرنے“ کے لفظ نے کار کے اندر سناٹا طاری کر دیا..... انہیں یاد آیا کہ انہیں تو مرنا ہے۔

”اب چکوال جانا ہے، دیکھو وہاں بھی ملتے ہیں یا نہیں..... یہ نا ہو کہ وہاں جا کر معلوم ہو کہ کے ٹو جاؤ۔ دیکھو، اگر ایسا کچھ ہوا تو میری طرف سے صاف انکار ہے یا روں! مجھے نہیں جانا کے ٹو۔“ طلال نے کار کے سنارے کو معطل کرنا چاہا۔

”سنا ہے وہاں جا کر خون جم جاتا ہے۔ انگلیاں جھڑ کر گر جاتی ہیں.....“ ہادی نے ٹھوڑی کو کھجاتے ہوئے پوچھا۔
 ”لیکن تمہاری پہلے زبان چھڑ کر گرے گی، قینچی کی طرح چلتی ہے خیر سے.....“

کہہ کر کار کا دروازہ کھول کر ابراہیم باہر نکلا۔ اسے ایڈریس کنفرم کرنا تھا۔ صالحہ نور نے انہیں ایک چھوٹا سا کام کہا تھا وہ اسی کام کے لیے اس طرف آئے تھے۔

ملازم انہیں باغ میں بٹھا کر اندر بتانے چلا گیا تھا۔

”کس چیز کی کمی ہے یا یہاں؟ بڑی عجیب سی جگہ لگ رہی ہے.....“ ہادی نے تین ایکڑ پر پھیلے فارم ہاؤس پر ایک نظر ڈالتے ہوئے ابراہیم سے پوچھا۔ سبز، درخت پرندے سب کچھ تھا وہاں لیکن پھر بھی ہر طرف بوجھل پن تھا۔
 ”کمی نہیں زیادتی ہے..... وحشت کی..... دل چاہ رہا ہے اٹھ کر بھاگ جاؤں.....“ ابراہیم نے کہا
 ”ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹا!“ خاتون کی افسردہ سی آواز آئی اور وہ ان کے سامنے آ کر بیٹھ گئیں۔ ”وحشت ہی وحشت ہے یہاں ہر طرف۔“

ابراہیم گڑبڑا گیا۔ کارٹن کھول کر ان کے سامنے کیا۔

”یہ ہم آپ کے لیے لائے ہیں۔ اس پیالے میں بیمار کو کھانے پینے کی چیزیں دینی ہیں اور اس والے میں پینے کا پانی۔“
 اب انہوں نے ذرا سا چونک کر تینوں کو دیکھا..... ہاتھ بڑھا کر پیالے نکال کر ہاتھوں میں لے لیے.....
 ”تم ملتان سے آئے ہو؟؟ صالحہ نے بھیجا ہے تمہیں.....؟؟“
 ”جی.....“

کتنی ہی دیر تک وہ آنسو بہاتی رہیں۔ فارم ہاؤس کی وحشت بڑھنے لگی..... ہادی نے اشارہ کیا کہ چلو چلیں بس۔
 ”پنڈی جا رہے تھے پتا نہیں کیسے ان کی جیپ نے آگ پکڑ لی۔ کہتے ہیں آگ کا جلا نہیں بچتا لیکن یہ بچ گئے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں دل“
 گردے، پیچھڑے، سب سلامت ہیں، بس کھال..... وہ ایسے جھلس گئی ہے کہ انہیں کسی پل چین نہیں آتا۔ بہت چیختے چلاتے ہیں۔ اسی لیے تو اس ویران جگہ آ کر رہنے لگی ہوں۔ اپنے بیٹوں اور بھائی کو بھی بہت یاد کرتے ہیں۔

سارا خاندان اجڑ گیا ان کا۔ چھوٹا بھائی کار کے حادثے میں فوت ہو گیا۔ میرے ہیرے جیسے بیٹے دریا میں ڈوب گئے۔ بھائی قتل ہو گیا۔ ماں باپ بیٹے کے غم میں مر گئے۔ چھوٹی بہن بیوہ ہو گئی۔ مجھے کس بات کی سزا ملی؟؟“
 خاتون اپنا دل ہلکا کر رہی تھی۔ وہ چپ چاپ سنتے رہے پھر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔
 ”صالحہ نور آپ کی کیا لگتی ہیں.....؟؟“ ظلال نے رک کر پوچھا۔

”اگر شادی ہو جاتی تو وہ میری بھابھی ہوتی.....“ اب وہ باقاعدہ رونے لگی تھیں۔
 تینوں سناٹے میں آ گئے..... صالحہ نور نے اس شخص کے لیے پیالے بھیجے تھے.....

”کیا صالحہ نے ہمیں معاف کر دیا ہے؟“ وہ سسکتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

”معاف نہ کیا ہوتا تو شفاء کیوں بھیجتی؟“



طلال نے سڑک کے کنارے بنے چھوٹے سے کھوکے کے قریب کار روک کر چاچا امام دین کے ٹھکانے کے بارے میں پوچھا۔

کپ سے پرچ میں چائے انڈیل انڈیل کر ”سڑکا“ لگاتے بزرگوار نے جلدی سے ہاں میں سر ہلایا۔

”میں جانتا ہوں.....“ اب وہ چائے میں ایک رسک ڈبو کر کھارہے تھے۔

”بتا دیں پھر.....“ ہادی اتنا ندید ا تھا تو نہیں لیکن وہ چائے اور ایک رسک کو دیکھنے لگا۔

”بتانے سے نہیں ملیں گے وہ ساتھ لے کر جانے سے ملیں گے۔ آؤ چائے پی لو..... گڑ چائے..... آجاؤ شاہباش.....“

بارش ہو تو درخت پودے، سبز انکھر کر گہرا سبز ہو جاتا ہے نا۔ یہ علاقہ ویسا ہی تھا۔ ہوا میں نمی تھی جیسے کچھ دیر پہلے بارش ہوئی

ہو۔ اونچے نیچے راستے، ٹیلے، چڑھائیاں اور سبزے کے میدان۔ درخت اتنے کہ گماں ہوتا تھا کہ قریب ہی کہیں ایبزون جنگل کی چھوٹی بہن واقع ہوئی ہے۔ دور پہاڑ دکھائی دیتے تھے کہ ذرا چلیں گے کہ تو بس قریب ہی آجائیں گے۔ ہوا بہت پر جوش اور خوش امید تھی۔

کھوکھا پتلی سڑک کے اس طرف تھا۔ کھوکھے کے پیچھے بڑا اور لمبا پانی کا تالاب تھا۔ الٹی چھلانگیں لگا لگا کر لڑکے اس میں کود رہے

تھے نہارہے تھے۔ چائے کی ”سڑک سڑک“ کے ساتھ ”شراپ شراپ“ کی آوازیں ماحول میں رنگ بھر رہی تھیں۔

باباجی نے انہیں گڑ چائے کو پرچ میں انڈیل کر ”سڑکا“ لگانے کا مشورہ دیا۔ اور demo دے کر بھی دکھایا۔ تینوں نے کپوں سے

چائے پرچوں میں انڈیل کر زوردار ”سڑک“ ماری اور باباجی نے تالی۔

”یہ ہوتا ہے اصل طریقہ چائے پینے کا..... شہر سے آئے ہو؟؟“

لکڑی کے بیچ پر اسکول کے بچوں کی طرح شرافت سے بیٹھے پرچ کو ہونٹوں سے لگائے انہوں نے ایک ساتھ ہاں میں سر ہلایا۔

”چاچا امام دین کے یہاں چھٹیاں گزارنے آئے ہو گے۔ کالجوں میں چھٹیاں ہو گئی ہیں نا.....“

”ہم مینٹل ہاسپٹل سے چھوٹ کر نکلیں ہیں.....“ ابراہیم زیر لب بڑبڑایا تو ہادی کا چائے کا گھونٹ پھوار بن کر باہر برس گیا۔ طلال

کو ہکا سا پھندا لگا۔ اس نے ہاتھ پیچھے لے جا کر ابراہیم کی کمر پر مکا مارا۔

”تم ذرا چپ نہیں رہ سکتے۔“

ابراہیم نے پرچ سے آخری گھونٹ سڑکا اور اپنا گولڈ میڈل مکا طال کی کمر پر رکھا۔ ”اب چپ ہو جاتا ہوں بھائی جان!“

”بہن بھائیوں نے چائے پی لی ہے تو چلیں.....؟؟؟ باباجی کے کان بہت تیز تھے۔

بہن ابراہیم نے شرٹ کے بازو فولڈ کیے، چھپر میں نہانے والے بچوں کو ایک نظر دیکھا اور کارا سٹارٹ کر دی۔

”ٹھیک سے گاڑی چلا لیتے ہونا؟؟“ باباجی خود ہی فرنٹ سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے تھے۔

ابراہیم زیر لب ہنس دیا۔ ”میں چار شہر بھگتا کر آ رہا ہوں جی۔“
 ”وہ اور بات ہوتی ہے.....“ بابا جی کھی کھی کرنے لگے۔

سانپ کی طرح لمبی پتلی لہراتی ہوئی سڑک تھی۔ اس پاس کا نظارہ بہت خوبصورت تھا..... اور پیچھے کا بھی..... جہاں سے دس گیارہ سالہ بچی اپنی گھوڑا گاڑی پر طوفان مچاتی آرہی تھی۔ لگائیں پکڑ کر کھڑی تھی اور گھوڑے کو پتا نہیں کیا کیا کہتی جا رہی تھی۔ وہ پیچھے کہیں سے کار کے ساتھ اپوں آپ ہی ریس لگاتی ہوئی آرہی تھی۔ تھوڑا سا ہانپ بھی رہی تھی۔ اب وہ ریس لگا رہی تھی تو اس نے بھی کار کی سپیڈ بڑھا دی۔ ادھر سپیڈ بڑھی تو ادھر بھی بڑھ گئی۔ وہ بڑا حیران ہوا، یعنی گھوڑا گاڑی پر وہ اس کی کار سے ریس لگا رہی تھی..... بچے بھی کیسی کیسی بچکانہ حرکتیں کرتے ہیں..... اس نے رفتار اور بڑھادی اس نے بھی ہار نہیں مانی۔ پتا نہیں کس زبان میں اس نے گھوڑے سے کچھ کہا کہ گھوڑا صرف گھوڑا نہ رہا..... وہ تو سیدھا ہوا سے باتیں کرنے لگا..... طلال کو شک ہوا کہ کہیں وہ ہوا میں اڑنے ہی نہ لگے۔

بابا جی نے کھڑکی سے سر باہر نکالا اور ہانک لگائی۔ ”شاوا بچے! شاوا.....“
 اور سر اندر کر کے یہ۔ ”بیٹا جی! اب تم جیت کے دکھاؤ۔“ (دیکھو ذرا)

تینوں نے بابا جی کو حیرت سے دیکھا۔ وہ تو مذاق مذاق میں ریس لگا رہا تھا۔ کہاں اس کی کار اور کہاں اس کا مریل سا گھوڑا، اور ٹوٹی پھوٹی گاڑی..... پھر بھی اب تو بات ہی عزت پر آگئی تھی۔ پیچھے سے ہادی نے گردن کو سیٹ کے درمیان پھنسا دیا تھا اور اس کے اوپر طلال نے..... ریس باقاعدہ شروع ہو چکی تھی.....

”یاراویار..... سپیڈ بڑھا..... سپیڈ.....“ ہادی نے لڑکیوں کی طرح اس کے بالوں میں ہاتھ ڈال کر کھینچا۔
 ”او بھائی کار ہے یہ جہاز نہیں.....“ ابراہیم کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ بچی آخر گھوڑے سے ایسا کہہ کیا رہی ہے کہ وہ بھڑک بھڑک کر سپیڈوں سپیڈوں دوڑا جا رہا ہے۔

”تو اس کے پاس کون سا ہیلی کاپٹر ہے..... ایک مریل سا گھوڑا ہی تو ہے.....“

”غور سے دیکھ بھائی وہ گھوڑا ہی ہے نا؟؟“ طلال نے ابراہیم کو چڑا نا چاہا.....

”لگ تو گھوڑا ہی رہا ہے..... ویسے میں نے کبھی لائیو دیکھا نہیں لیکن کیا گھوڑے ایسے دوڑتے ہیں.....؟“

ان کی کار میں بیٹھ کر بابا جی ان ہی کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ ابراہیم نے خائف نظروں سے بابا جی کو دیکھا۔

”شاوا بابا جی..... شاوا..... ہماری کار میں بیٹھ کر ہمارے ہی خلاف..... دیکھو ذرا.....“

”سامنے دیکھ کر بیٹا جی! ویسے ہی تم ہار رہے ہو.....“ بابا جی نے ونڈسکرین کی طرف اشارہ کیا اور ہنس دیے۔ ہی ہی ہی۔

پہلے دس منٹ تو دونوں تقریباً برابر رہے۔ کبھی ذرا سا آگے، کبھی بس ذرا سا پیچھے۔ پھر ایکدم سے..... بالکل ایکدم سے بچی نے

”ہراہ“ کہہ کر لگام کو جھٹکا دیا..... گھوڑا، گھوڑا نہ رہا، راکٹ، میزائل، جہاز باز، شاہین سب بن گیا..... یہ جاوہ جا.....

پورے ایک منٹ، چالیس سیکنڈ تک ان کی کار گھوڑا گاڑی سے پیچھے رہی۔ بچی نے پھر انہیں سڑک پر راستہ ہی نہیں دیا۔ وہ ساری

سرک پر مل مار کر اپنا گھوڑا دوڑاتی لہراتی رہی.....

زندگی میں ان کا بہت کچھ ٹوٹا تھا، مان، دل، کبھی کوئی ہڈی وغیرہ، لیکن ایسے ان کا غور نہیں ٹوٹا تھا۔ ایک دس سالہ بچی نے، گھوڑا گاڑی سے انہیں ہرا دیا تھا۔ کچھ ہاریں بہت مہنگی نہیں بہت سستی جگہ سے ملتی ہیں۔ کچھ تکلیفیں انجکشن کی سوئی کی طرح بڑی جان لیوا سی ہوتی ہیں..... سی..... آہ..... ہائے.....

جیسے مقابلہ کے اختتام پر کھلاڑی آمنے سامنے آ کر ہاتھ ملاتے ہیں۔ ویسے ہی بچی گاڑی سے کود کر ان کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ طلال کار کے بونٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ ہادی کار سے ٹیک لگا کر کھڑا تھا۔ ابراہیم سے ٹھیک سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ سہارے کے طور پر اس نے دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال لیے..... ہار سہارنا آسان نہیں ہوتا نا.....

”اسلام علیکم جی.....“ ہاتھ سر تک لے جا کر اس نے سلام کیا۔

”وعلیکم اسلام! شاباش، کس کلاس میں ہو؟“ طلال نے بونٹ پر بیٹھے بیٹھے تالی ماری۔ بچی کی جیت کے واضح آثار دیکھتے ہوئے اس نے سر کھڑکی سے باہر نکال کر سیٹیاں مارنی شروع کر دی تھیں۔ وہ بچی کو سپورٹ کرنے لگا تھا۔ ابراہیم نے جل کر اسے دیکھا اور پھر بچی کو جو بڑا کھلکھا کر ہنس رہی تھی۔ تیل لگا کر کس کر چوٹی بنائی ہوئی تھی۔ اپنے قد سے کئی گنا بڑا دوپٹہ لیا ہوا تھا۔ پوری مائی پھٹناں لگ رہی تھی۔

”پانچویں میں جی.....“ اس مائی پھٹناں نے دو نام کروڑوں اور ایک گولڈ میڈلسٹ کو ہرا دیا تھا۔

ہادی لڑھکڑا کر گرتے گرتے رہا۔ شرارتا کھانتے ہوئے مسکرا نے لگا۔ ”تمہاری کیا عمر ہے ابراہیم؟ پانچویں پاس ہونا تم؟“

ابراہیم نے جل کر چاروں کو دیکھا۔ پھٹناں نے واپس گاڑی پر چھلانگ لگائی، لگام کھینچی، ہانک لگائی اور غائب ہو گئی۔

”کیسی رہی پھر ریس؟“ لو اب بابا جی زخموں کے لیے نمک، مرچ، ہلدی لے آئے تھے۔

”کار کی سروس نہیں ہوئی تو..... ویسے بھی سائنس کے بقول جانور مشین سے زیادہ ہوشیار اور تیز رفتار ہوتا ہے۔“ (یہ سائنس صرف اس نے ہی پڑھی تھی)

”کوئی بات نہیں بیٹا جی! اس ہفتے کروا لیتے ہیں ایک ریس۔ ایک جیسے گھوڑے، ایک جیسی گاڑیاں۔ مشینوں کو دغاں کرتے ہیں۔ بولوا بولوا ہاں؟؟“

”بول کے دکھاؤ اب ناں.....“ ہادی نے اس کے شانے کو شانے سے ٹھوکا اور آنکھ ماری۔

”ہاں ہے بابا جی..... ہاں ہی ہاں ہے.....“ طلال نے ہاتھ اٹھا کر ڈیل ڈن کی.....

”بس پھر اس ہفتے..... تین تم..... تین ہماری بچیاں.....“

”تین.....؟؟“ طلال اور ہادی چونکے۔ وہ سمجھے بس ابراہیم کو لگا جا رہا ہے۔

”ٹھیک ہے بابا جی! منظور ہے..... منظور ہے.....“ اب ابراہیم نے ہاتھ اٹھا کر ”ڈیل ڈن“ کی.....

سیانے کہتے ہیں جو گڑھا دوسروں کے لیے کھودو، اس میں انسان خود گر جاتا ہے۔“ کار میں بیٹھتے ہوئے اس نے دونوں کو سیانوں کی

بات یاد کروائیں..... اور گڑھا..... جس میں وہ سب ہارنے کے بعد گرنے والے تھے..... شرم سے.....



چھوٹا سا ہنستا بستا گاؤں تھا۔ بہت ہی سادہ، اللہ لوگ لوگ تھے۔ چند سال پہلے گاؤں کے ایک سیانے کو زہریلے بچھونے کاٹ لیا تھا۔ وہ دلدلی جھاڑیوں میں زندگی و موت کی جنگ لڑ رہے تھے کہ اسکول سے چھوٹے بھائیوں کے ساتھ آتی سارہ نے چاچے کو زمین پر لوٹ پوٹ ہوتے دیکھ لیا۔

گاؤں تو بہت دور تھا، جیسے تیسے تینوں نے مل کر چاچے کو گاڑی میں لٹایا اور سارہ نے گھوڑے کی لگاموں کو ذوردار جھٹکا دیا۔ اس نے شہر کی سڑک پر وخت ڈال دیا تھا۔ کسی بس، ٹیکسی، کار کو گزرنے نہیں دیا تھا اور چاچے کو ڈسپنسری پہنچا کر ہی دم لیا تھا.....

اس سے پہلے گاؤں والوں کو سارہ کے گھوڑا گاڑی دوڑائے پھر نے پر بڑا اعتراض رہا کرتا تھا۔ سیانے کہتے تھے وہ گاؤں کی دوسری لڑکیوں کو بھی خراب کر دے گی.....

اس نے گاؤں کی دوسری لڑکیوں کو بھی اپنی طرح کا کر دیا تھا۔ چاچا اللہ بخش نے ہسپتال سے آتے ہی سب سے پہلے اپنی تینوں بیٹیوں کو اس کی طرح گھوڑا گاڑی دوڑانا سیکھایا تھا۔ پھر گاؤں بھر میں ہوا چل پڑی تھی۔ ہر بچی اپنے باپ، بھائی، چاچے، مامے کی گھوڑا گاڑی کو اپنی سواری سمجھتی تھی۔ لڑکیوں کو سواری پر سوار ہونا بھی آنا چاہیے اور سواری چلانا بھی..... وہ گھوڑا ہو، کار یا جہاز.....



بابا شاوا، انہیں چاچا امام دین کے پاس اس ریس کے بعد ہی لے کر جانا چاہتے تھے۔ انہیں ان کے گھوڑے اور گاڑیاں دے دی گئیں کہ وہ پریکٹس کر لیں.....

”ہم بچیوں سے ریس لگاتے ہوئے اچھے نہیں لگیں گے باباجی!“ طلال نے اپنی طرف سے ریس سے برطرف ہونا چاہا۔

”ڈر گئے ہو؟“

”ایسے ہی وہ ہار گئیں تو ان کا دل برا ہوگا..... ہو سکتا ہے وہ روئیں بھی.....“

”تم اس دن ہار گئے تھے تو روئے تھے؟؟؟ ان میں اسپورٹس مین شپ ہے۔ سمجھے.....“ باباجی کو تو انگلش بھی آتی تھی۔ ”ہمیں اور ہمارے گاؤں کو ایویس کیوں نہ سمجھنا۔ پوری طرح سے ریس کی تیاری کرو شاہاش! پورا پورا مقابلہ ہوگا.....“

”پورا پورا مقابلہ..... وہ بھی ہم مرے مکوں سے.....“ تینوں کچھ فکر مند سے تھے۔

وہ صبح سویرے اپنی گھوڑا گاڑیوں پر نکلنے اور پریکٹس کرتے۔ شروع میں عجیب لگا پھر اچھا لگنے لگا۔ انہیں احساس ہوا کہ یہ ایسے ہی جیسے ہوا میں اڑنا۔ جیسے ہر بوجھ سے آزاد ہو جانا۔ جیسے زمین کی حیات اور کائنات کی گردش کا حصہ بننا۔ گھوڑے بھی تھوڑی بہت ان کی زبان سمجھنے لگے تھے۔ لگاموں پر گرفت مضبوط ہونے لگی تھی۔

”تم گھوڑے سے کچھ کہتی تھی اور وہ تیز دوڑنے لگتا تھا۔ کیا کہتی ہو تم؟“ ایک دن وہ مائی پھنساں سے ٹپس لینے لگے۔ بچی نے زبان

کو رول کر کے حلق سے کچھ آوازیں نکالیں جو کوشش پر بھی ان سے نہیں نکالی گئیں۔

”تم کہتی کیا ہو بس وہی بتا دو.....“

”اوے شیرا چل اڑ کے دکھا..... چیتا بن چیتا..... شاوا میرے لکڑ شاوا.....“

گھوڑا تے اونٹوں شیر..... نالے چیتا میر لکڑ..... شاوا ابھی شاوا۔“ تینوں نے ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھا۔

”گھوڑا مانڈ نہیں کرتا کہ اسے شیر پھر لکڑ کیوں کہا؟؟ ویسے یہ دونوں ہی نہیں اڑتے.....“ ہادی نے سنجیدگی سے پوچھا اور بتایا۔

”گھوڑے کا مانڈ اس طرح کی باتوں کو مانڈ میں نہیں رکھتا۔ پھر اس نے کون سا شیر کو دیکھا ہوا ہے۔“ اس نے معصومیت سے کہا۔

”تو وہ خود کو شیر سمجھ کر دوڑتا کیسے ہے..... جب دیکھا ہی نہیں تو؟“ طلال بھی کنفیوز تھا۔ وہ واقعی میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔

”کیونکہ وہ ہم انسانوں کی طرح بے کار کے سوالوں میں نہیں الجھتا۔ اب بھلا آپ میرا گھوڑا ہوتے تو سوال پوچھ پوچھ کر ہی میرا

سر کھالینا تھا۔ اسی لیے آپ گھوڑا نہیں بنے..... چیچ چیچ.....“

”تمہیں گھوڑا ہم سے بہتر لگتا ہے.....؟؟“ ابراہیم کو ہنسی آگئی۔

”ہاں! وہ چپ چاپ دوڑتا ہے..... اور جیت کر دکھاتا ہے.....“ اس نے فخریہ اپنے گھوڑے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں بھی جیت کر دکھاؤں گا.....“ ابراہیم کو جوش آیا۔

”پہلے گھاس کھا کر دکھائیں..... ہی ہی ہی.....“

تینوں دل کھول کر بنے.....

ان کے پاس پر یکٹس کے لیے دن تھے۔ وہ گھوڑوں کی پیٹھ تھپکتے، انہیں کھانا وانا کھلاتے، تالاب سے پانی پلاتے۔ پھر انہی چھانٹیں

لگاتے تالاب میں نہاتے۔ شام کی گڑ چائے بابا شاوا کی طرف سے ہوتی۔ وہیں گاؤں کے سب بڑے بھی آجاتے۔ سب مل ملا کر چائے

سرٹکتے.....

یہاں وقت میں بہت برکت تھی۔ دن گزرتا نہیں تھا، وقت ڈھلتا نہیں تھا، آسمان کی طرح ٹھہر کر بڑا تسلی بخش سا لگتا تھا۔ ایک ایک

سانس اپنی موجودگی کی خبر دیتی تھی۔ یہاں افراتفری اور بھاگم دوڑ کا کہیں کوئی نشان نہیں تھا۔ کیا یہاں کے لوگ اتنے صابر بنا کر رہتے کہ زندگی

کا کارواں یہاں پڑاؤ ڈال کر بیٹھ گیا تھا۔ کیا یہ وہی خطہ زمین نہیں تھا جو قتل، ظلم، نا انصافی سے پاک تھا اور اسی لیے وقت برکت، فضاء رحمت

اور زندگی فضل و کرم سے مامور تھی۔ عقل والے ان ہی خطوں کی طرف ہجرت کرنا پسند کرتے ہیں کیونکہ رحمت کے فرشتے یہاں پرواز کرتے

ہیں.....

وہ لمبی گھاس سے لہلہاتے اونچے نیچے راستوں پر چہل قدمی کرتے گاؤں کی خوب صورتی پر فدا ہوتے۔ ہر طرف سبز ہی سبز تھا۔

اللہ نے سبز رنگ کو بہت پسند کیا ہے۔ ساری دنیا سبز رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ سکون کے سارے خزانے سبز رنگ کی ملکیت میں ہیں۔ یہ

انسانی آنکھ کو ٹھنڈک اور انسانی دل کو سکون اور اُمید دیتا ہے۔ صوفیوں نے بھی اسی لیے اس رنگ کو پسند کیا ہے۔

سبز، نیلی، پیلی اور گلابی کاغذی جھنڈیاں.....

”یہ ہو کیا رہا ہے..... انہوں نے ریس کو اتنا سیریس لے لیا ہے؟“ طلال نے حیرت سے چیخ ہی مار دی۔

وہ تینوں دُور اوپر ٹیلے پر کھڑے تھے۔ نیچے کھلا میدان تھا۔ چھوٹے بچے رسی کے ساتھ جھنڈیاں لگا رہے تھے۔ بین حرموی کے میدان کی طرح انہیں گول گول گھومنا تھا۔ سفید چاک سے حد بندیاں کی جا رہی تھیں۔ بابا جی شاوا، ہر کام میں پیش پیش تھے۔ شام چار بجے ریس کا وقت تھا۔ ادھر اھر ٹیلوں، درختوں پر بچوں کا جھوم آ کر جمع ہو چکا تھا۔ کچھ بڑے بوڑھے بھی موڑھوں، چارپائیوں پر بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ ایک بچہ نقلی پستول چلا کر، گولی کے پٹانے کو چیک کر رہا تھا۔ پستول نقلی تھی لیکن اس کا پٹا بخیر بڑا اصلی تھا۔ اتنی زور سے گونجا کہ اوپر کھڑا ہادی اس کی گونج سے سہم سا گیا۔

”یار یہ کون لوگ ہیں یا.....“ سینے پر ہاتھ رکھ کر اس نے کہا۔ پٹانے نے اس کے دل کی دھڑکن کو بڑھا دیا تھا۔

یار لوگ، انہیں نیچے سے ہاتھ ہلا ہلا کر اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے اور گھڑی کی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ بس وقت ہونے ہی والا ہے۔ وقت ہونے ہی والا تھا اسی لیے گاؤں کی سادہ بھولی بھالی عورتیں بھی اس طرف آرہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے رش بڑھنے لگا۔ شاید ساتھ کے گاؤں کے لوگ بھی آئے تھے۔ تینوں نے سہم کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

”دیکھنا کہیں ٹی وی چینل والے بھی تو نہیں آئے ہوئے۔ بہت بے عزتی ہونی ہے آج۔“ طلال نے آنکھیں سکیڑ کر جھوم کو گننا چاہا۔

”ہاں یا رزرا چیک کرو، پتا چلے لائیو ٹیلی کاسٹنگ ہو رہی ہے.....“ ابراہیم کان کھجانے لگا۔ انہیں یہ گاؤں اچھا لگا تھا، یہاں کے سادہ، بھولے بھالے لوگ بھی.....

لیکن یہ معصوم بھولے بھالے لوگ..... اب چالاک ہو رہے تھے، ان کی جان نکالنے والے تھے..... دیکھو زرا!



ان کی گھوڑا گاڑی کے دائیں بائیں ایک ایک بچی کی گھوڑا گاڑی کھڑی تھی۔ تیل لگا کر کس کر بال بنائے ہوئے سروں پر دوپٹے لیے ہوئے۔ بہت اعتماد سے گھوڑوں کی لگائیں پکڑ کر، گھوڑوں کے کانوں کی طرف جھک کر سرگوشیاں کرتے ہوئے، وہ پوری تیاری کے ساتھ آئی تھیں۔

ان کی دیکھا دیکھی ہادی بھی گھوڑے کے کان کی طرف جھک گیا۔ ”میرے شیر، میرے کلڑ، جیتو ادینا یا ر! اللہ تیرا بھلا کرے گا۔“ اللہ بھلا ہی کرنے والا تھا..... مقابلہ شروع ہونے سے پہلے انہوں نے دائیں بائیں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر سر کے اشارے سے سلام کیا۔ ابراہیم نے سر اٹھا کر تیسرے نمبر پر کھڑے ہادی اور پہلے نمبر پر کھڑے طلال کو دیکھا اور ہاتھ لہرایا۔ اس نے دونوں سے کہہ دیا تھا کہ اب طے پا ہی گیا ہے تو وہ جیتنے کی پوری پوری کوشش کریں۔ یعنی ان تین میں سے کوئی ایک تو جیتے۔

نقلی پستول کا اصلی پٹا بخیر گونجا.....

چھ کے چھ نے اپنی اپنی لگاموں کا جھٹکا دیا۔ کوشش کر کے انہوں نے حلق سے مانی پھٹتا جیسی آوازیں نکالنی سیکھ لی تھیں۔ زبان کو

رول کر کروہ وہی آوازیں نکال رہے تھے..... ابھی شیر چیتے، کلڑ کہنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ سب گھوڑے ایک رفتار سے دوڑ رہے تھے۔ زمین کا سبز اسمٹ کر ان کے گرد آگیا اور انہیں اپنی بانہوں میں لے لیا۔ نیلا آسمان، سفید بادل، سورج کی ٹھنڈی روشنی، ان کے ساتھ بھاگنے لگے۔ ہادی اور طلال نے ہر شے کو اپنے گرد گھومتے پایا.....

پہلا چکر شروع ہوا.....

اللہ نے زندگی کو پسند کیا، اسی لیے اسے بنانا۔ اپنے لیے ”بندگی“ کو اسی لیے بندے میں روح (زندگی) پھونکنے کو۔ دوسرا چکر ختم ہوا.....

زمین کہیں گلستاں ہے، کہیں صحرا، کہیں اجاڑ، کہیں آباد۔ راکھ اور پھول، کنکر اور دھول..... اور یہی انسان کی زندگی تیسرا چکر..... آخری چکر.....

ہر شے، ہر عمل، ہر فرض کی قضاء ہے..... ”زندگی کی نہیں“..... ہر گناہ کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا ہے، لیکن زندگی کی معطلی کے لیے نہیں۔ زندگی میں موت واجب نہیں۔ زندگی فرض اولین ہے۔ پہلی سانس سے، آخری سانس تک۔ اس فرض کی کوئی قضا نہیں۔ جینا ہی ہے..... جینا ہی ہوگا..... موت کی طلب حرام ہے، موت کی طرف پیش قدمی حرام ہے..... موت پر گرفت حرام ہے.....

طلال اور ہادی نے لگاموں کو قوت لگا کر جھٹکا دیا۔ ان کے حلق سے پر جوش آوازیں نکلیں۔ اس آخری چکر میں انہیں اپنی پوری جان لگا دینی تھی..... انہوں نے لوگوں کے شور کو دود سمجھا..... ساتوں آسمانوں کو مہرباں پایا..... ہادی ونگ لائن کر اس گیا..... پیچھے ہی طلال..... نقلی پستول کے اصلی پٹانے ترتیب سے پٹاخ پٹاخ گونجے، گاؤں والوں کا شور اور بچوں کی تالیاں.....

سب سے آخر میں ابراہیم نے لائن کر اس کی تھی۔ اس کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں، وہ انہیں آستین سے پونچھنے میں مصروف ہو چکا تھا۔ ”ہم جیت گئے یار.....“ ہادی چھلانگ لگا کر طلال کی گھوڑا گاڑی میں کود گیا تھا۔ بابا شاوا بھی اسی گاڑی پر کود گئے تھے۔ گھوڑا گاڑی پر کھڑی بچیاں بھی ان کے لیے تالیاں بجا رہی تھیں۔ نیچے کھڑی مائی پھتاں بھی.....

”میں بھی جیت گیا..... یا اللہ تیرا شکر۔“ اس نے ان دونوں کو دیکھا اور پھر سر اٹھا کر آسمان کو۔

☆ ☆ ☆

پیارے قارئین: یہ ”جیت“ ان کے علاج کی آخری دوا تھی۔ کڑوی گولیوں کے ساتھ ڈاکٹر ایک مٹھی گولی دیتے ہیں نا؟ یہ وہی گولی تھی۔ جوش و جذبہ بیدار کرنے کا سیرپ.....

☆ ☆ ☆

”وہ سامنے اوپر پہاڑی دیکھ رہے ہو؟؟ وہی ہے چاچا امام دین کا ٹھکانہ.....“

”وہ دور..... بہت دور سامنے اوپر..... اتنی بلندی پر.....؟؟ ہادی نے حیرت سے چاچا امام دین کو دیکھا۔

”جوان جہان ہو..... بلند یوں سے ڈرتے ہو؟؟“

”نہیں جی وہ..... چڑھائی سے.....“

”لفٹ تو یہاں کسی بھی پہاڑ پر نہیں ہے۔ پرندے بھی اپنی پیٹھ پر بٹھا کر اوپر نہیں لے جاتے۔ یہ سروس انہوں نے ابھی شروع نہیں کی نا۔“ بابا شاوا نے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

ہادی نے خائف ہو کر طلال نے کھی کھی کرتے ہوئے بابا شاوا کو دیکھا۔ ابراہیم نے سلام دعا لے کر قدم اوپر کی سمت بڑھا دیئے۔ اللہ نے پہاڑوں کو بہت پسند کیا ہے۔ یہ وہ کیل ہیں جو زمین پر ٹھونکے ہوئے کھڑے ہیں۔ یہ وہ جلیل ہیں جو انسان کو بلندی حوصلے اور استقامت کی ترغیب دیتے ہیں..... پہاڑ..... یہ امید اور سر بلندی کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہیں.....

تینوں چھوٹی سی کوٹھری کی بیرونی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اندر چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ جگہ کی کمی تھی تو وہ باہر ہی کھڑے ہو گئے تھے۔ چاچا امام دین بالآخر یہاں انہیں مل گئے تھے.....

”جب کوئی مرنے کا ارادہ کرتا ہے، غمزدہ اور پریشان ہوتا ہے تو کیا ساری خدائی خاموش نظر رہ جاتی ہے؟ اللہ کی رحمت جوش نہیں مارتی؟ اللہ کبھی غافل نہیں ہوتا۔ وہ زمین پر انسانوں کو اور آسمان سے فرشتوں کو ہماری مدد کے لیے بھیجتا ہے۔ لیکن جس کے لیے مدد بھیجی جائے وہ اپنی ضد چھوڑے تو سہی۔ ہدایت کو وصول تو کرے.....“

بیٹا تم جیسا پوزیشن ہولڈر اسٹوڈنٹ اس بار بورڈ میں صرف پاس ہو گیا، ڈاکٹر بننے کے لیے ایڈمیشن نہیں ملا تو تم نے اپنی کلائی کاٹ لی۔ ایک لمحے کے لیے تم نے رک کر سوچا کہ ایسا کیوں ہوا؟ کس نے تمہیں روک دیا؟ کسان باپ تمہیں کھیتی باڑی میں لگانا چاہتا تھا، کیا پتا خدا بھی یہی چاہتا ہو۔ دو تین سال کسان بنے رہتے، زمین کو سمجھتے، پرکھتے۔ زرعی سائنس دان بن جاتے۔ جو تم نے سوچا تھا وہی ہو گا تو ہی تم زندہ رہو گے؟ جو اللہ کا پلان ہے وہ ہو گا تو تم خود کو ختم کر لو گے؟؟

بی بی آپ کا جوان بیٹا حادثے میں شہید ہو گیا۔ تین سال گزر گئے اور رو کر آپ نے آنکھوں کی پینائی گنوالی۔ دل کی مریضہ بن گئیں۔ زندگی کو خود پر حرام کر لیا۔ اللہ کو یہ پسند نہیں کہ زندہ انسان خود پر موت کو طاری کرے، لیکن آپ تو صرف بیٹے کی ماں ہیں، اللہ کا بندہ تھوڑی ہیں جو اللہ کی ناراضی کی فکر کریں گی۔ ماں، باپ، بیٹا، بیٹی، یہ رشتے نا طے تو دنیا کے لیے ہیں۔ ہماری پہلی حیثیت بھی بندگی ہے اور آخری بھی۔ جب سارا معاملہ ہی بندے اور بندے کے رب کے درمیان ہے تو آپ صرف ماں بن کر کیوں زندہ ہیں؟ صرف بیٹے کے لیے کیوں مر رہی ہیں؟؟ اللہ کو بھول گئی ہیں؟ بی بی! بیٹے کو یاد رکھیں، اس کی موت کو بھول جائیں..... غم سے نکل آئیں، اللہ کو راضی کریں۔

بیٹا تم بچوں سمیٹ پہاڑ سے کود رہی تھیں۔ کس لیے؟ کہ جوانی میں بیوہ ہو گئیں؟ تین وقت کی روٹی کے لیے؟ لوگ عزت کے در پر تھے اس لیے؟ رشتہ داروں نے نظریں پھیر لیں؟؟

اللہ کی نظر میں تم ہو..... یہ کیوں بھول گئیں؟ تین بار تم نے مرنا چاہا، تینوں بار اللہ نے تمہیں بچایا۔ اللہ کی محبت کے اور کتنے ثبوت چاہتی ہو؟ جو تمہیں بچانے کے لیے مدد بھیج سکتا ہے، وہ روٹی بھی بھیج سکتا ہے۔ سر کی چھت بھی دے سکتا ہے۔ ایک شوہر کو ہی اپنی کل کائنات

سمجھ لیا تھا؟ اسے اپنا رازق بنالیا تھا؟

اس دنیا میں لوگ بھوک سے نہیں کم ہمتی سے مرتے ہیں۔ شیطان تمہارے دلوں میں بھوک کے وسوسے ڈال دیتا ہے۔ وہ تمہیں آنے والے وقت کی خوفناک تصویریں دکھاتا ہے۔ وہ تمہیں بتاتا ہے کہ تم تنہا اکیلے اور کمزور ہو۔ اور تم کم عقل یہ نہیں سوچتے کہ اللہ ہر وقت ہر جگہ موجود ہے..... تم تنہا اور اکیلے کیسے ہوئے؟

چھوٹی بی بی آپ کوئی زہریلی چیز کھا چکی تھیں۔ آپ کی ماں بہت پریشان ہیں آپ کے لیے۔ آپ کا رنگ کالا ہے، آپ موٹی، بھدی اور بد صورت ہیں..... آپ نے اب تک اپنے بارے میں یہی سب جانا ہے؟؟ ان تین باتوں کے لیے آپ ہر روز موت کی طلب کریں گی؟ اس عظیم رب کو کتنی بار بتائیں گی کہ اس نے آپ میں ایسے ایسے خراب نقص رہنے دیے۔ خوب صورت ہوتیں تو آپ کی جلدی شادی ہو جاتی۔ بس یہی ہے آپ کی کل زندگی کی فکریں؟؟ آپ کا مقصد؟؟ ایک شوہر حاصل کرنا؟؟ خوب صورت نظر آنا؟؟ اپنی جھولی اور نصیب آپ کو خالی دکھائی دیتا ہے۔ اتنی سی وجہ کے لیے پاگل ہو گئی ہیں۔ زندگی کو جہنم بنالیا ہے۔

اپنا جہنم آپ لوگ خود تیار کرتے ہیں..... اپنے ہی ہاتھوں سے.....

اس کائنات کی خوبصورتی بھی تمہاری خوبصورتی ہے۔ اللہ نے تمہاری اس صورت کو بنانا پسند کیا اسی لیے بنایا۔ اگر تم بد صورت ہو، تو پھر کائنات کی ہر شے بد صورت ہے۔ اگر مالک اپنی بندگی کے لیے بد صورتی کو پسند کرتا ہے تو بس وہی شے خوبصورت ہے۔ انسانوں کے پیانوں کی اتنی فکر کیوں کرتی ہو؟ اللہ نے تمہیں اپنے لیے بنایا ہے، اپنی حیثیت کو پیچا نو..... اللہ کے لیے خوبصورت بنو.....

اپنے غموں کو پیٹا کیوں بنالیتے ہو؟ صبر کو آگ کے دریا میں کیوں بدل دیتے؟ نہ گھونٹ بھر سکتے ہو نہ پار کر سکتے ہو۔ اتنے کمزور تو نہیں پیدا کیے گئے تم۔ پوری عقل اور ساری سمجھ دی گئی ہے تمہیں۔ ساری نشانیاں اور علم۔ پھر کہاں گم ہو؟ کیوں بھٹک رہے ہو؟

اپنی ذمہ داریاں پہنچا نو۔ غفلت سے جاگو۔ نافرمانی اور ظلم سے بچو۔ انسانوں کے مددگار بنو اور مددگار بنے رہو۔ اپنی عقلوں اور دلوں کے قفل کھولو۔ اللہ کی بے زاری اور مہر سے ڈرو۔ تم خود کو ناکارہ اور نالائق ثابت کرنے پر ہی کیوں تلے ہوئے ہو؟ کیوں اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہو۔ ایک جھٹکا لگتا ہے اور ایمان ڈول جاتے ہیں۔ اللہ پر یقین ڈگمگاتا ہے..... ”اللہ ہے بھی یا نہیں، وہ سنتا بھی ہے یا نہیں“ ہم یہ سوال کرنے لگتے ہیں۔ یہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے، یہاں سب کو آزمائش سے گزرنا ہوگا..... سب کو..... آزمائشیں بھییں بدل بدل کر آئیں گیں۔ تو کیا کرو گے؟ فیمل ہونا پسند کرو گے.....؟ پاس ہونے کے لیے کوشش بھی نہیں کرو گے؟

”اتنے کم ہمت نہ بنو..... زندگی موت کے شکنجے میں دم توڑنے لگے تو بھی شیر بن کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دو۔“

تینوں شیروں نے سر کو پوری طرح سے اندر کیا اور چاچا جی کو دیکھا.....

☆ ☆ ☆

”اسلام علیکم.....“ سب جا چکے تو وہ ان کے سامنے جا کر کھڑے ہوئے۔

”وعلیکم السلام.....“ ٹھیک ٹھاک ہوا؟؟؟ خوشی سے ان کا چہرہ دکنے لگا اور انہوں نے اٹھ کر تینوں کو گلے سے لگالیا۔

چاچا امام دین..... یہ وہی ہیں جن کے پیچھے انہوں نے کھیڑا کان میں نماز ادا کی تھی۔

”پھر آپ نے ہمیں یہ امانت کے چکر میں کیوں ڈالا..... یا وہاں آپ کے کوئی جڑواں بھائی تھے؟“

”میری امانت یہ تھی! نہیں، میری امانت تمہاری تندرستی تھی۔ زندگی کی طرف تمہاری واپسی تھی۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ابراہیم نے

میری امانت مجھ تک پہنچا دی ہے۔ تمہارا شکر یہ ابراہیم.....“ وہ ابراہیم کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

ہادی اور طلال نے چونک کر ابراہیم کی طرف دیکھا۔

”زندگی کی محراب پر لکھی تحریر کا پہلا لفظ ”موت“ ہے۔ موت جوڑ ہے توڑ نہیں۔ وقت مقررہ پر اللہ کے حکم کے ساتھ۔ نہ لمحہ پہلے نہ

لمحہ بعد۔ موت کو یاد رکھنا عبادت اور اس کی چاہ کرنا گناہ ہے۔ موت بری شے نہیں، یہ اگلی منزل کی طرف سفر کا نام ہے۔ یہ سفر اسے ہی نصیب

ہوگا، جس نے زندگی کی ٹرین میں بیٹھ کر چھکڑوں، طوفانوں، تکلیفوں، دکھوں، آزمائشوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہوگا۔ اسے نہیں جو بیچ راستے میں

ہی ٹرین سے کود گیا ہوگا۔ زندگی کے فرض کی کوئی قضا نہیں ہے ہادی..... زندگی کی ہر سانس فرض اولین ہے طلال.....“

دونوں خاموشی سے سنتے رہے اور سر ہلاتے رہے۔ پھر بابا جی امام دین کے ساتھ گڑ والی چائے سڑک کر باہر آ گئے۔ ابراہیم کے

اشارے پر وہ اوپر اور بلندی کی طرف چڑھنے لگے تھے۔

”یہ سب؟ میں ٹھیک سے سمجھ نہیں پایا ابراہیم! کوئی پلان تھا؟“ تینوں کنارے سے پاؤں نیچے لٹکا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ دور سارا

جہاں دکھائی دیتا تھا۔ ہادی پوچھ رہا تھا۔

”اللہ کے ہر کام میں حکمت اور ہر بھلائی پلاننگ ہی ہوتی ہے۔ لیکن ہم ان دونوں کو ہی نہیں سمجھتے۔ میں تمہیں بابا جی امام دین کے

پاس لے کر گیا تھا..... بس.....“

”تم بابا جی امام دین کو پہلے سے جانتے تھے؟“

”ہاں..... ایک بار ملا تھا.....“ اس کی سانس بوجھل ہو گئی۔ ”اب تک تم تھوڑا بہت سمجھ ہی گئے ہو گے۔ بابا جی امام دین نے تمہاری

حالت کو پوری طرح سے سمجھ لیا تھا۔ جسمانی، روحانی، ذہنی، سب حالتوں کو۔ ڈاکٹر مریض دیکھ کر دوا تجویز کرتا ہے، تمہاری پہلی دوا بھاء بھولو

تھے۔ انہوں نے تمہارے جسم سے ستر سے اسی فیصد بیماری نکال باہر کی تھی.....“

ہادی کو پھر سے بھاؤ یاد آ گئے۔ وہ انہیں بہت مس کرتا رہا تھا۔ ”وہ بھی ڈاکٹر ہیں.....؟؟“

”ہاں ڈاکٹر..... تم ایک سال سے دوائیوں پر زندہ تھے۔ نیند کی گولیاں کھا رہے تھے۔ قدرتی نیند نعمت ہوتی ہے، یہ نیند تم دونوں کو

وہیں آئی تھی۔ انہوں نے ہی تمہارے دماغوں سے منفی سیلز صاف کیے تھے.....“

اگر انسان دکھ پر صبر نہ کرے تو یہ دکھ ناسور بن جاتا ہے۔ پھر اس ناسور کی جڑیں گہری ہونے لگتی ہیں۔ غم، نا اُمیدی اور مایوسی میں

بدل جاتا ہے۔ زیادہ دکھی رہنے اور غم کرنے سے اسے لیے منع کیا گیا ہے۔ سائنس کی عام زبان میں غم کی ان جڑوں کو منفی سیل یا کیڑے کہا

جاتا ہے۔ منفی، منفی جمع ہوتا رہتا ہے، اور دماغ میں منفی کیڑوں کا ڈھیر لگنا شروع ہو جاتا ہے۔ تم کہہ سکتے ہو کہ یہ

ایک بہت بڑا خونخوار جانور بن جاتا ہے۔ یہ جانور پورے دماغ کو کنٹرول کرنے لگتا ہے۔ ظاہر ہے دماغ دل اور پورے جسم کو کنٹرول کرتا ہے۔ اب انسان وہی کرتا ہے جو یہ جانور (منفی دماغی سسٹم) چاہتا ہے۔ چونکہ وہ اس سسٹم کو ایکٹو کر چکا ہے، اور پھر کنٹرول نہیں کر پاتا۔ اسی لیے ہمیں منفی جذباتوں سے دور رہنے کا درس دیا گیا ہے۔ غصہ، نفرت، حسد، لڑائی جھگڑا، دشمنی، غرور، جاہلیت، بے جا غم، وغیرہ۔ اسی لیے اسلام نے پہلا درس ”صبر“ قناعت اور درگزر کا دیا ہے کہ ہم ان منفی کیڑوں سے بچے رہیں۔ بھاء کی حویلی میں جو جو کچھ ہوا، وہ سب تمہارے جسم سے بیماری نکالنے کے لیے ہوا۔

تمہاری بیماری کا سلسلہ تمہارے دکھوں سے شروع ہوا تھا۔ تم نے بھاء کا داؤ ”صبر، رضا، ایمان“ لگایا ہوتا تو نوبت موت تک نہ آتی۔ جب ان کا کام ختم ہو گیا تو انہوں نے تمہیں صالحہ نور کے پاس بھیج دیا۔ جس کے ہاتھوں میں اللہ نے شفاء دی ہے۔ ”تو ہمارے اس سفر میں جو جو کچھ ہوا وہ سب کچھ.....“

”وہ سب کچھ اللہ کی طرف سے تھا۔ مدد تھی اللہ کی۔ ہمیں لگتا ہے کہ آسمان سے فرشتے اُڑتے ہوئے آتے دکھائی دیں گے تو ہی ہم یقین کریں گے کہ اللہ نے ہمارے لیے مدد بھیجی ہے۔ ہمارے لیے کوئی معجزہ ہوا ہے..... ہمارے لیے ہر روز کئی معجزے ہوتے ہیں۔ ہمیں ہر روز کئی سبق دیے جاتے ہیں لیکن ہم اپنی بند آنکھیں کھولتے ہی نہیں.....“

”اسی لیے ہم بھاء کے ٹرانس میں چلے گئے تھے.....؟؟“

”کہہ سکتے ہو..... جس انسان نے غم کے پہاڑ سر کیے ہوں، صبر کے سمندر پیئے ہو، اس کی حیثیت معمولی تو نہیں ہوگی۔ تم چاہتے بھی تو ان کی حویلی سے باہر نہیں جاسکتے تھے۔ بابا امام دین نے تہجد میں تمہارے لیے دعائیں کی ہیں۔ تمہاری زندگی اور سمجھ بوجھ کے لیے انہوں نے اللہ کو بڑی شدت سے پکارا ہے۔ اللہ نے انہیں اپنا مددگار چنا ہے..... بہت خاص ہیں وہ۔“

”تم بابا امام دین سے کیسے ملے تھے.....؟؟“

ابراہیم کے چہرے کے رنگ بدلے۔ ”اسی طرح جس طرح تم ملے تھے۔“ اس کی اداسی بہت دلگرفتہ سی ہو گئی۔

”کیوں مرنا چاہتے تھے تم؟؟ کیا ہوا تھا؟؟“ وہ اب تک ایک ابراہیم کے بارے میں ہی نہیں جان پائے تھے۔

اس کی آنکھیں نم ہوئیں لیکن پھر وہ مسکرا دیا۔ ”اماں ابا نہیں تھے میرے۔ ماموں نے بیٹوں کی طرح پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ باکسر بھی بنایا۔ ان کی بیٹی تھی ایمان۔ دوست تھی میری، پھر محبت بھی ہو گئی۔ بہت معصوم تھی سی تھی۔ اس کا خالہ زاد بھی اسے پسند کرتا تھا۔ رشتہ بھی بھیجا لیکن ماموں نے میری وجہ سے انکار کر دیا۔ بہت تلخیاں، لڑائی جھگڑے ہوئے۔ میں ایشین اولمپک کے لیے گیا ہوا تھا۔ پیچھے سے ماموں کا فون آیا کہ گولڈ میڈل لے کر ہی آؤں۔ ان کی ناک پر بات آ گئی ہے.....“

میں نے گولڈ میڈل جیت لیا، شادی کی تیاریاں ہونے لگیں.....“ کہہ کر وہ رک گیا۔ غیر محسوس اس نے ایک پتھر کو گرفت میں لے

لیا۔

”نکاح سے ایک دن پہلے مہندی کی رات ایمان ننکھے سے لٹکی ہوئی ملی تھی۔“

طلال اور ہادی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا..... دونوں نے اپنا اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔
 ”میری خالہ شادی کے لیے مجھے اپنے گھر لے گئی تھیں۔ مہندی کے لیے سارا خاندان وہیں موجود تھا۔ ایمان اپنے گھر تھی۔ اوپر اپنے کمرے میں اکیلی تھی..... وہ اس کے کمرے میں آگیا.....“ ضبط سے ابراہیم کی آنکھیں سرخ ہونے لگیں۔
 ”وہ بے چاری اپنی بے حرمتی کی چوٹ نہیں سہہ سکی۔ اس چوٹ کے ساتھ وہ میری زندگی میں بھی نہیں آنا چاہتی تھی..... اس نے اسی رات.....“

سارا جہاں نے ابراہیم کے ساتھ ایک سسکی بھری.....

”اگر وہ زندہ رہنے کی ہمت کر لیتی تو میں سب کچھ سنبھال لیتا۔ بس وہ زندہ رہ لیتی.....“

”تم نے کیوں مرنا چاہا پھر.....؟؟“

”نفرت ہو گئی تھی ساری دنیا سے..... لیکن جب زندگی کی قیمت کا احساس ہوا تو فیصلہ کیا کہ اب سلور گولڈ میڈل نہیں لوں گا.....

انسانوں کا مددگار بنوں گا..... بابا امام دین کی طرح..... بھاء کی طرح.....“

”تو ہم تمہارے مریض تھے.....“ ہادی ہنس رہا تھا۔

”مریض نہیں..... احسان..... تم وہ احسان ہو جو اللہ کی رحمت نے ہم پر کیا ہے۔ ہمیں بھائی کے اس نظام میں مددگار بنا کر۔

بھاء، صالحہ، امام دین، یہ سب اور ایسے دوسرے لوگ اللہ کے اس نظام کا حصہ ہیں، جو اللہ نے اپنے بندوں کی مدد کے لیے بنایا ہے۔ یہ سب تو بہت عظیم لوگ ہیں۔ میں تو بس چھوٹا موٹا سا پرزہ ہوں۔ اور شاوا بھی اسی سسٹم کا حصہ ہیں۔

و ایسے تم دونوں کی دوائیاں میرے پاس موجود تھیں۔ تلال تمہارے ماما پاپا گوجرانولہ تک ہمارے پیچھے پیچھے رہے ہیں۔ اور یاد آیا

تمہیں بچے نے نمک کی چیزیں دی تھیں کہاں ہیں وہ؟؟“

طلال گڑبڑا گیا..... ”وہ پھول تو میں نے صالحہ کو دے دیا.....“

”کیوں بھلا.....؟؟“ ہادی مسکراہٹ چھپا کر پوچھ رہا تھا۔

”بہت خدمت کی تھی اس نے ہماری.....“ وہ کان کھجانے لگا۔ ”کل ریس کے بعد میں نے بھاء کو فون کیا تھا“ کہا کہ ہماری شادی

میں آنا ہے۔ کہنے لگے اکیلا نہیں آؤں گا۔ پر تم پہلوانوں کی فوج کو ویسے کی روٹی کھلا دو گے؟؟ سوچ لو.....“

دونوں نے قہقہہ لگایا۔ ”بڑے تیز ہو یا ر! لڑکی کو پھول بھی دے دیا“ شادی کی ساری پلاننگ بھی کر لی۔ بھاء سے کیا کہا پھر؟؟“

”وہ تو پھر میں نے ماما سے پوچھا کہ کیا ہم اتنے امیر ہیں کہ پہلوانوں کی فوج کو چند دن مہمان رکھ سکیں؟؟“

بابا..... تینوں کے قہقہے ایک ساتھ چھوٹے.....

”تمہارا ولیمہ کھانے کے بعد میں واپس جا کر اپنی اسٹڈی مکمل کروں گا۔ یا ر بچے نے تمہیں ”خنجر“ دیا تھا“ اس کا کیا مطلب تھا؟؟“

”کہ میں تمہارے اندر موجود موت کی خواہش کا گلا کاٹ دوں۔ مجھے اسی وقت یقین ہو گیا تھا“ کہ میں جیت جاؤں گا۔“

”بھائی جی! آپ میں شاہین باجی کون ہے جی؟؟“ ایک بچہ ہانپتا ہوا ان کے پاس آیا۔ شاید بابا جی نے بھیجا تھا۔

شاہین باجی نے اسے گھور کر دیکھا۔ ”کیوں کیا کام ہے.....؟؟“

”شاہین کے پر لایا ہوں جی! بابا جی نے کہا ہے آپ کو دے دوں۔ ہم سب بچے وہ وہاں کھڑے ہیں، ذرا اڑ کے دکھا دیں.....“

دو تین اور بچے ہنگ گلائڈنگ کے بیگ پیٹھوں پر لادے ہوئے اوپر چڑھے۔ ہادی نے حیرت سے انہیں اور پھر ابراہیم کو۔ ابراہیم

نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا، پھر کمر پر مکا مارا..... ”چلو شاہین! ذرا اڑ کے دکھاؤ ککڑ صاب!“

ککڑ، تیتڑ، بیڑ اور شیر نے جسم پر فٹنگ کی..... طلال اور ابراہیم اٹھ کر کنارے پر آ کر کھڑے ہو گئے.....

”یا اللہ تیرا شکر ہے.....“ ہادی نے کنارے پر کھڑے ہو کر آسمان کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں نم تھیں۔ اسے پھر سے

ماں یاد آئی لیکن مسکراتی ہوئی، اس کی بلانیں لیتی، اس پر نثار ہوتی ہوئی۔ سر گھما کر دونوں کو دیکھا، جوش سے چلایا اور کنارے سے اٹھ کر آسمان

کی طرف اڑنے لگا.....

آسمان جو گواہ ہے کہ زندگی ”بلندی“ ہے اور ہم اس کے ”شاہین“۔

